آرزو کے مرحلے



محمود احمد مودی

پچھلے چند دنوں تک توصیف کی عجیب کیفیت تھی ۔ایک عجیب سا اضطراب تھا جو اس کے وجود میں کروٹیں لے رہا تھا ایک ہیجان تھا جو اس کے رگ وپے میں دوڑ رہا تھا، ایک بے چینی و بے قراری تھی جو اسے ہمہ وقت ایک ہی بات ایک ہی شخصیت کے بارے میں سوچتے رہنے پر مجبور کرتی ۔اب اکثر اس کے تصور میں ایک دلکش سراپا لہراتا رہتا اور سنسنی موج در موج جسم کی دیواروں سے ٹکراتی پھرتی ......اس کا کسی کام میں بھی دل نہ لگتا۔کبھی کبھی تو اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی اور وہ پراگندہ ذہن سے منتشر خیالات جھٹکنے کی کوشش کرتا لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا.............بس ایک

اضطراب تھا.......... ہیجان تھا............ بے قراری و بے چینی کا
احساس تھا جو بپھرے ہوئے سمندر کی طرح اسے بہا لے جا رہا تھا۔
عام طور پر آدمی کی یہ کیفیت ٹین ایج میں ہوتی ہے جب کوئی محبت کی
منہ زور ندی اسے حقیر تنکے کی طرح بہا لے جا رہی ہو۔
توصیف پہلی نظر میں عشق کا نوجوانی میں بھی قائل نہیں رہا تھا۔ ابا تو عمر
میں پختگی آ گئی تھی۔ اب بھلا کیونکر اس کا دل اس فلسفے کا قائل ہوتا؟ وہ
اب دو بچوں کا باپ تھا۔ اس کی عمر پینتیس سے اوپر تھی اور سب سے
بڑی بات یہ تھی کہ شادی اس کی پسند سے ہوئی تھی پھر.........اب یہ
اس کیساتھ کیا ہو رہا تھا؟ یہ کیسی تشنگی تھی جو اچانک اسکے جذبات میں
ہلچل مچا کر اسے بے چین رکھتی تھی؟۔
زندگی سے اسے کبھی کوئی خاص شکوہ بھی نہیں رہا تھا۔ خواہشیں اور
خواب تو سبھی کی زندگی میں ہوتے ہیں ایک کو چبان یا خوانچہ لگانے

والا بھی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے عزائم رکھتا ہے اور کروڑوں کی جائیداد اور کارخانوں کے مالک بھی مزید ترقی کے خواب دیکھتے ہیں چنانچہ توصیف نے بھی اپنی تمام تر آسودہ حالی اور زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہونے کے باوجود ترقی کے خواب تو دیکھتا تھا۔ وہ زمانے کی دوڑ میں تمام تر جوش و جذبے اور تندہی کے ساتھ شریک تھا لیکن یہ کوئی عیب نہیں تھا۔

اسے یہ اطمینان بہر حال حاصل تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی خلا کوئی احساس محرومی نہیں تھا جس سے گھبرا کر وہ عشق کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا۔ اپنی بیوی سے وہ بیزار نہیں تھا۔ وہ ایک خوش شکل پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار عورت تھی۔ اچھے طبقے میں اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ بھی جانتی تھی اس کے زیادہ کان بھی نہیں کھاتی تھی ان کے گھر میں چخ چخ کا ماحول نہیں تھا کبھی کبھار تھوڑی بہت تیز کلامی تو ہر گھر

میں ہو جاتی ہے ان کے ہاں بھی کبھی کبھار ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے جلد ہی اس سے چھٹکارہ حاصل کر لیتے تھے۔ بات بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی کافی خوشگوار گزر رہی تھی۔

اس کے بچے بھی ڈھنگ کے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا سات سال کا تھا لڑکی پانچ سال کی تھی.....دونوں بہت اچھے سکول میں پڑھ رہے تھے اسے دونوں سے پیار تھا.........بہت پیار تھا۔

بیوی بھی اسے ابھی تک اچھی ہی لگتی تھی پھر بھلا وہ کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہونے کا جواز کیونکر ڈھونڈ سکتا تھا؟ اور عشق بھی پہلی نظر میں.........؟ وہ بھی اس شدت کا.........کہ وہ خود بھی گھبرا گیا تھا۔

ایسی شدت تو اس نے لڑکپن یا نوجوانی میں بھی کسی لڑکی کے بارے میں محسوس نہ کی تھی۔

آخر یہ کیا تھا.........؟ کون سے تشنگی تھی جو یوں ایک دم ابھر کر سامنے آئی تھی؟ اس نے بہت سوچا.........اپنے آپ کو بہت ٹٹولا لیکن ان سوالوں کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے بجائے اس کا دل انجان اندیشوں میں دھڑکنے لگا ستم ظریفی یہ تھی کہ جس پر وہ پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو گیا تھا وہ بھی شادی شدہ تھی اور وہ بھی تقریباً اسی کے بچوں کی عمر کے دو بچوں کی ماں تھی۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ کوئی اسے دور ہی سے ایک نظر دیکھ کر اس کا دیوانہ ہو چکا ہے۔ وہ بے چاری تو ویسے ہی گرد و پیش سے بے نیاز دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کچھ انجانے خیالات میں کھوئی رہتی ہو۔ بظاہر وہ اپنے دونوں بچوں کو اپنے دائیں بائیں ایک ایک ہاتھ کی انگلی تھمائے بس اسٹاپ پر آتی تھی لیکن اس کا ذہن جیسے کہیں اور ہوتا تھا۔ حسین، ریشمی سیاہ بالوں کی ایک شریر لٹ ہمیشہ اس کی مرمریں پیشانی پر جھولتی رہتی

تھی........اور اس لٹ میں توصیف یزدانی کا دل بہت بری طرح اٹک گیا تھا۔

توصیف یزدانی ایک کامیاب آرکیٹکٹ تھا اس کی اپنی ایک چھوٹی سی آرکیٹکٹ فرم تھی جس میں چھ آدمی اس کے ملازم تھے۔فرم بہت بڑی نہ سہی لیکن اس کے پاس ہمیشہ کام رہتا تھا توصیف یزدانی سمیت سب ہمیشہ مصروف رہتے تھے بہت اچھی آمدنی تھی۔توصیف یزدانی کی گزر بسر خوش حالی سے ہو رہی تھی۔ڈیفنس میں اس کا ذاتی بنگلا تھا۔ میاں بیوی کے پاس الگ الگ گاڑی تھی۔کوئی مالی پریشانی نہیں تھی۔ توصیف ایک دراز قد اور وجیہہ آدمی تھا۔خوش لباس بھی تھا عمر پینتیس سال ہونے کے باوجود تیس بتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔اسکے معمولات میں یکسانیت تھی۔مزید بلندیوں اور کامیابیوں کی طرف اسکی نظر ضرور تھی لیکن وہ نہایت صبر وسکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ دھیرے

دھیرے منصوبہ بندی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی ہلچل کوئی ہیجان اور کوئی ہنگامہ نہیں تھا لگے بندھے معمولات تھے۔

لیکن پھر ایک روز اس نے اس عورت کو دیکھ لیا..........

اور یکدم جیسے اس کی زندگی سے سکون اور ٹھہراؤ رخصت ہو گیا۔ کم از کم اس کے ذہن سے رخصت ہو ہی گیا تھا بظاہر اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی سب کچھ اسی طرح رہا لیکن یہ صرف وہ خود ہی جانتا تھا۔ کہ سب کچھ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا........ شاید صرف اسی لئے کہ اسکا زاویہ نظر بدل گیا تھا........ اسکی سوچ بدل گئی تھی۔

اس دن کے بعد سے گویا اس کے رگ و پے میں ایک عجب سے ہیجان بھرا رہتا۔ اس کے ذہن میں ایک خلفشار بھرا رہتا۔ کام سے اس کا

دھیان ہٹنے لگتا۔ گھر میں وہ کچھ غائب دماغ سا دکھائی دینے لگا۔

سر دست اسکی بیوی ستارہ نے ان تبدیلیوں کو زیادہ محسوس نہیں کیا تھا .... اگر کسی حد تک اس کی توجہ ان تبدیلیوں کی طرف گئی بھی تو اس نے دل ہی دل میں یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ دفتر میں کام کی زیادتی کے اثرات ہیں حالانکہ دفتر میں کام اسی طرح چل رہا تھا جس طرح پہلے چلا کرتا تھا۔

بات یہ نہیں تھی کہ توصیف نے زندگی میں اس جیسی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ بلاشبہ اسے خوبصورت عورتوں میں تو شمار کیا جا سکتا تھا لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے کوئی انوکھی یا غیر معمولی طور پر حسین قرار دیا جا سکتا۔ توصیف نے زندگی میں اس سے بھی زیادہ حسین نہ جانے کتنی عورتیں دیکھی تھیں وہ ان کی صحیح تعداد کا تعین بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ان میں سے کئی نے تو زندگی کے کسی موڑ پر مہربان نظروں سے اس کی

طرف دیکھا بھی تھا لیکن نہ تو مواقع ایسے تھے کہ مہربان نظروں کے تبادلے کا سلسلہ آگے بڑھتا اور نہ ہی اس کے ذہن نے اسے پرسکون زندگی میں کوئی ہلچل برپا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

یوں کہنا چاہیے تھا کہ اس سے پہلے معاملہ کبھی اس کے دل کے ہاتھوں میں نہیں آیا تھا۔ پاسبان عقل نے ہمیشہ ان کی نگہبانی کی تھی لیکن اب گویا آغاز سے ہی معاملہ عقل و خرد کی حدود سے نکل گیا تھا وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قطعی قاصر تھا۔ عقل اس کا کوئی جواز فراہم نہیں کر سکتی تھی دل ہی ایسے پاگل پن میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ اس نے پہلے روز اس عورت کو دیکھا اور اس کی نس نس جیسے پکار اٹھی کہ بس وہی اس کی منزل تھی اور اگر وہ اسے نہ ملی تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ ڈیفنس کے دوسرے بہت سے بچوں کی طرح توصیف کے بچے بھی علاقے کے ایک بہت اچھے اسکول میں پڑھتے

تھے مگر وہ اس علاقے میں ہونے کے باوجود اس کے گھر سے بہت دور تھا گھروں سے بچوں کو لانے کیلئے بہت عمدہ بس سروس موجود تھی زیادہ تر لوگ اسی سے استفادہ کرتے تھے اور خود گاڑی میں بچوں کو چھوڑ کر آنے یا ڈرائیور کے ساتھ بھیجنے کی نسبت اس میں زیادہ آسانی محسوس کرتے تھے۔

بہت کم گھرانے ایسے تھے جن کے بچے والد یا والدہ........ یا پھر ڈرائیور کیساتھ گھر کی گاڑی میں اسکول جاتے تھے۔ زیادہ تر والدین خود یا ان کا کوئی ملازم بچوں کو مین روڈ پر گھر کے کسی اسٹاپ پر پہنچا دیتا تھا۔ بس مقررہ وقت پر اسٹاپ پر پہنچتی تھی۔ باوردی ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی اس ایئر کنڈیشنڈ بس میں موجود ہوتا تھا جس کی وجہ سے والدین کو اور بھی اطمینان رہتا تھا۔

توصیف بھی اپنے دونوں بچوں کو اسی بس میں بٹھانے کے لئے

انہیں گاڑی میں لے کر روڈ تک آتا تھا۔ بس گلیوں میں نہیں آتی تھی۔ اس کی آمد کے متوقع وقت سے صرف ایک دو منٹ پہلے توصیف گھر سے نکلتا تھا کیونکہ اسی وقت وہ آفس کیلئے بھی روانہ ہوتا تھا۔ بچوں کو بس میں بٹھانے کے بعد وہ دوسری سمت میں روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کا آفس ٹھیک نو بجے کھل جاتا تھا اور وہ خود بھی آفس کھلتے ہی نو بجے پہنچ جاتا تھا خود مالک ہونے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو سحر خیزی اور جلد آفس پہنچنے کا عادی بنایا ہوا تھا۔ اس طرح جلدی زیادہ کام نمٹانے میں بہت مدد ملتی تھی۔ جس دفتر میں مالک وقت پر پہنچتا ہو وہاں ملازمین بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

وہ عورت بھی اسی طرح اپنے دو بچوں کو بس میں سوار کرانے کیلئے ٹھیک اسی وقت آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ ٹہلنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی پیدل آتی تھی۔ اس کا گھر غالباً سڑک کی دوسری طرف سامنے

والی گلی میں ہی تھا۔

لیکن توصیف نے چند دن پہلے ہی اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

شاید وہ لوگ اسی گلی میں نئے ہی آئے تھے۔

توصیف نے سنا تھا کہ کچھ دیر پہلے ہی اس گلی میں بنگلا بکا تھا شاید اسی بنگلے میں کوئی نئی فیملی آئی تھی ورنہ پاس پڑوس کے زیادہ تر چہرے توصیف کے شناسا تھے۔ وہ گلی توصیف کی گلی کے بالکل سیدھ میں تھی درمیان میں سے مین روڈ گزر رہی تھی اس کے باوجود اس گلی کی حیثیت توصیف کی گلی والوں کیلئے پاس پڑوس کی تھی۔

ایک گلی میں کھڑے ہو کر دوسری گلی میں دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

.........اور توصیف نے پہلے ہی دن خاص طور پر دیکھ لیا تھا کہ بچوں میں بس میں سوار کرانے کے بعد وہ عورت کس بنگلے میں گئی تھی اس مقصد کیلئے اس نے گاڑی کچھ دیر تک اسی گلی کے کونے پر روکے رکھی

تھی اور اسے جاتے دیکھ کر اس کا دل گویا کنپٹیوں میں دھڑکتا رہا تھا ....اور اس ستمگر نے گویا مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔یعنی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پیچھے گلی کے کونے پر کوئی گاڑی روکے کسی قدر محویت انہماک اور اشتیاق سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

وہ عام اور شکن آلود سے گھریلو کپڑوں میں تھی گرد و پیش سے بے پرواہ اور بے نیاز انداز میں چلتے ہوئے بھی اسکی کمر میں شاخ گل کی سی لچک تھی۔اس کے خوبصورت تراشیدہ بال ہر قدم کے ساتھ اس کے کندھوں پر ہلکورے لے رہے تھے۔اور وہ فضا میں جیسے اپنے وجود کی ایک انوکھی مہک چھوڑ گئی تھی جو توصیف کے حواس پر چھا گئی تھی اپنے گھر کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے بھی اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر نہیں دیکھا تھا اور گویا اپنی ہی کسی دھن میں مگن اپنے ہی کسی خیال میں الجھی سیدھی اندر چلی گئی۔

توصیف نے اس گلی میں گاڑی موڑ لی اور نہایت سست رفتاری سے چلاتا ہوا اس بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ بنگلا اس کے اپنے بنگلے کی طرح ہی زیادہ طویل و عریض یا زیادہ پر شکوہ نہیں تھا۔ اس کا اونچا گیٹ یوں بند ہو چکا تھا جیسے کسی نے کوئی حسین راز اپنے دل میں چھپا کر دل کا دروازہ بند کر دیا ہو۔

توصیف کو اس بے پرواہ مگر خوش ادا عورت کی جھلک تک بھی دکھائی نہ دی تاہم اس نے اس گھر کا نمبر دیکھ لیا جو گیٹ کے ایک پلر پر نمایاں حروف میں درج تھا۔

''تھرٹی.........بی.........'' وہ گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب خواب ناک سی مسکراہٹ تھی۔ نمبر ایک بار ہی دیکھ کر گویا اس کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ اس گلی میں رہنے والے چند ایک افراد سے اس کی

رسمی سی شناسائی تھی۔ اس علاقے میں رہنے والے زیادہ تر لوگوں کی ایک دوسرے سے رسمی سی شناسائی تھی بہت کم لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔

اس روز وہ آفس پہنچ تو اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے حواس پر بجلی گر چکی تھی اور وہ کوئی پیشہ ورانہ ذمے داری انجام دینے کے قابل نہیں رہا تھا، رہ رہ کر اس کے ذہن میں ایک ہی تصویر ابھر آتی تھی۔

اسے کچھ یوں لگے رہا تھا جیسے وہ تو جنم جنم سے اس عورت کی تلاش میں تھا نہ جانے کب سے اس کی روح اس کی طلب کی پیاسی تھی اس کا رواں رواں اس کا ہر مسام جاں گویا اسے پکار رہا تھا اس کا تمنائی تھا۔

الٹے سیدھے انداز میں اس نے دفتری کام انجام دیئے۔

دن گزارنا اس کے لئے دوبھر ہو گیا تھا۔

عید کا چاند نظر آنے کے بعد رات کو سونا بچوں کے لئے دشوار ہوتا ہے

عید کا انتظار گویا اس کی نس نس میں اضطراب بھر دیتا ہے۔خوشی ہیجان اور ایک بے عنوان سے جوش و خروش کے باعث ان کی نیند اڑ جاتی ہے کچھ ایسی ہی کیفیت اس رات توصیف کی تھی وہ بے تابی سے منتظر تھا کہ صبح ہو تو وہ اٹھ کر تیار ہو، ناشتہ کر کے بچوں کو گاڑی میں بٹھائے اور مین روڈ پر پہنچ کر اس حسن بے پرواہ کی آمد کا نظارہ کرے۔جس نے ایک پل میں اس کا قرار لوٹ لیا تھا اسے اس انوکھے احساس اور جذبات کی ان شدتوں سے روشناس کرایا تھا جن سے وہ نوجوانی میں بھی آشنا نہ تھا اگر اس پر ایسا کوئی دور آیا بھی تھا تو وہ اسے بھول چکا تھا۔

............یہ گویا اس کا نیا جنم تھا۔

سونے سے پہلے اسکی بیوی نے کئی بار اسے مخاطب کیا۔کوئی بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن خلاف معمول وہ صحیح طور کوئی جواب نہ دے

سکا اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ بظاہر وہ بیوی کے قریب تھا لیکن درحقیقت اس سے اتنا دور تھا کہ شاید اس کا تخیل بھی اسے نہیں چھو سکتا تھا۔ بیویوں کی چھٹی حس ان معاملات میں غیر معمولی طور پر بہت تیز ہوتی ہے۔

"کیا بات ہے........آج تم کچھ پریشان اور کھوئے کھوئے سے دکھائی دیتے ہو؟" ستارہ نے اس کی ذہنی غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ایں.....کک.......کیا.....؟" توصیف نے گویا اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا" تم نے کچھ کہا......؟"

ستارہ نے اسے عجیب نظروں سے گھورا۔ پھر بولی" میں پوچھ رہی تھی کہ آج تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو.......کیا بات ہے؟"

"اوہ..." توصیف نے گہرا سانس لے کر ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو

رگڑا جیسے اس عمل سے وہ تصورات سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائے گا پھر وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا ’’وہ کچھ کاروباری پریشانی ہے.........اور کوئی بات نہیں۔‘‘

’’کیا مجھے نہیں بتاؤ گے کہ ایسی کیا کاروباری پریشانی آن پڑی ہے کہ تم اتنی دیر سے گم صم بیٹھے ہوئے ہو‘‘ ستارہ نے جاننا چاہا۔

توصیف نے جلدی سے بات ٹالنے کی کوشش کی ’’ایک بلڈنگ کا ڈیزائن تیار کرنے کا کنٹریکٹ بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا لیکن وہ ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا ہے۔

’’آپ اس قسم کی باتوں سے اپنا ذہنی سکون برباد نہ کیا کریں۔‘‘ ستارہ وفا شعار بیویوں کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی ’’جو ہمارے مقدر میں ہوگا ہمیں ضرور ملے گا اور جو ہمارے مقدر میں نہیں ہے وہ ہم حاصل نہیں کر سکتے خواہ کچھ بھی کر لیں آپ صرف اپنی ہی

جدو جہد کرتے رہیں۔اسکا نتیجہ اللہ تعالی پر چھوڑ دیا کریں.......اگر ایک بلڈنگ کا کنٹریکٹ نہیں ملے گا تو ہم بھوکے تو نہیں مر جائیں گے ہمیں کس چیز کی کمی ہے؟''

ستارہ بے چاری کو یہ یاد نہ رہا کہ اس طرح کے مواقع تو پہلے بھی کئی بار اس کی زندگی میں آئے تھے لیکن توصیف نے کبھی اس قسم کے مسائل کو کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔آج کیا خاص بات ہو گئی تھی؟

وہ اسے مزید کچھ دیر سمجھانے کی کوشش کرتی رہی اور وہ بظاہر اس کی باتوں سے متاثر ہو کر گویا مطمئن ہو کر کروٹ بدل کر سو گیا.......لیکن درحقیقت وہ جاگ رہا تھا اس لئے اسے کروٹ بدلنی پڑی تھی اس کا منہ ستارہ کی طرف نہیں تھا ورنہ شاید اسے شبہ ہو جاتا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

اس سے پہلے اگر وہ کبھی رات کو کسی وجہ سے صحیح طور پر سو نہیں پاتا تھا تو

صبح اس کی طبیعت میں کسلمندی ہوتی تھی لیکن اس روز رات کا زیادہ تر حصہ جاگ کر گزارنے کے باوجود وہ الارم بجتے ہی روز سے کہیں زیادہ مستعدی اور تیزی سے اٹھا اس ساری تیزی اور طراری کی وجہ محض ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید آج پھر وہی دلربا اپنے بچوں کو چھوڑنے سٹاپ پر آئے۔ بار بار اس اندیشے سے اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا کہ کہیں اس کی جگہ کوئی ملازم یا ملازمہ یا پھر بچوں کا باپ بچوں کو چھوڑنے نہ آ جائے تاہم وہ اپنی موہوم امید کے سہارے جلدی جلدی تیار ہوا۔

ناشتا کر کے وہ بچوں سے بھی پہلے جانے کیلئے پر تولنے لگا۔ بچے حسب معمول اپنی آپس کی چھوٹی موٹی لڑائیوں اور ماں کے ساتھ روز مرہ کی چھوٹی موٹی ضد میں لگے ہوئے تھے توفیق بضد تھا کہ وہ لنچ میں ابلا ہوا انڈا لے کر جائے گا اور مریم کی فرمائش تھی کہ اسے لنچ میں ایک

خاص قسم کے بسکٹ ضرور دئے جائیں اس کے علاوہ بھائی اس بات پر بہن کا مذاق اڑا رہا تھا کہ اس کے جوتے خوب اچھی طرح نہیں چمک رہے تھے۔توصیف روزانہ انکی فرمائشوں اور چھوٹی موٹی معصومانہ نوک جھوک سے بہت محظوظ ہوتا تھا اور مسکراتا رہتا تھا۔کبھی کبھی اس میں دخل بھی دیتا تھا لیکن آج اس کا دھیان ان باتوں کی طرف نہیں تھا۔

ان کے تیار ہوتے ہی وہ اسی طرح ان کو گاڑی میں بٹھا کر نکلا جیسے اب بہت دیر ہو چکی ہو حالانکہ وقت وہی روز والا تھا۔اس کی گاڑی گلی

بستر سے اٹھ کر سیدھی بچوں کو چھوڑنے چلی آئی تھی چہرے پر ذرا بھی میک اپ نہیں تھا۔ لپ اسٹک تک نہیں لگی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ان تمام مصنوعی سہاروں کے بغیر اور اس عالم بے پرواہی میں بھی جیسے سر سے پاؤں تک سنوری ہوئی تھی۔ اسے گویا ان سہاروں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک جنبش ابرو سے قیامت ڈھا سکتی تھی۔

وہ بچوں کے ساتھ توصیف سے کچھ فاصلے پر آن کھڑی ہوئی توصیف کا دل ایک بار پھر گویا کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اسے اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہوا اس کا دل چاہا کی کسی طرح کسی بہانے اس سے کوئی بات کرے........اور کچھ نہیں تو وہ اتنا ہی کہہ سکتا تھا کہ آج بس شاید کچھ لیٹ ہے حالانکہ وہ لیٹ نہیں تھی اس کی متوقع آمد میں کم از کم دو منٹ باقی تھے لیکن بات کرنے کا یہ بہانہ کچھ برا بھی نہیں تھا لیکن برا ہوا اس کی زبان کا............جو گویا خشک ہو کر اس کے تالو سے جا چپکی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔ خود کو اپنی کم ہمتی پر ملامت کی آج کل تو نو عمر لڑکوں کی زندگی میں پہلی بار اپنی من چاہی کسی لڑکی سے بات کرتے وقت بھی یہ حالت نہیں ہوتی تھی۔

وہ بس ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہا مگر اس نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ جیسے اسکی موجودگی سے ہی بے خبر تھی۔ مگر ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟۔

توصیف نے سوچا......... کوئی اتنے قریب سے آپ کو آنکھیں پھاڑے تک رہا ہو تو آپ اس کی موجودگی سے بے خبر کیسے رہ سکتے ہیں؟۔ خصوصاً ایک عورت کا تو اس طرح رہنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ تو کیا وہ بن رہی تھی؟۔ یا واقعی کم از کم اس وقت اس کا ذہن کہیں اور ہوتا تھا؟ شاید ابھی نیند کی غنودگی اسکے ذہن پر باقی تھی وہ سوچتا رہا ....اور بس سوچتا ہی رہا حتی کہ بس آ گئی وہ اپنے بچوں کو بس میں

سوار کرا کے واپس چل دی اور توصیف کا دل بھی گویا سینے سے نکل کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اسے واپس جاتے دیکھنا توصیف کیلئے اور بھی زیادہ صبر آزما نظارہ تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بس میں سوار کرانا ہی بھول گیا تھا۔ وہ چند سیکنڈ اس کی طرف منتظر سے انداز میں دیکھتے رہے پھر خود ہی بس میں سوار ہو گئے۔

بس روانہ ہو چکی تھی توصیف نے دیکھا وہ اپنی گلی کے کونے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ وہیں ساکت کھڑا رہا حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

اس روز کا تصور توصیف کے ذہن میں اور گہرا ہو گیا۔ طلب میں کچھ اور شدت آگئی۔ وہ خود پر حیران تھا۔ اس کی اپنی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا تھا؟

تیسرے روز توصیف نے اس عورت کو گاڑی میں بچوں کے علاوہ ایک مرد کے ساتھ اسٹاپ پر آتے دیکھا۔ وہ یقیناً اس کا شوہر تھا وہ اس

کی برابر کی سیٹ پر بڑی تمکنت سے بیٹھی تھی۔اس روز وہ بنی سنوری تھی۔مرد بھی سوٹ میں تھا۔شاید وہ کہیں جانے کیلئے تیار ہو کر نکلے تھے اور انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ جاتے جاتے پہلے بچوں کو اسٹاپ سے اسکول بس میں سوار کرا دیں گے۔

توصیف نے دو دن تک اسے نہایت سادگی اور بے پروائی کے عالم میں میک اپ سے بے نیاز دیکھا تھا تو اسے گمان گزرا تھا کہ شاید وہ اسی طرح زیادہ اچھی لگتی ہو گی، بنی سنوری حالت میں پرتکلف لباس میں میک اپ کے ساتھ شاید وہ اتنی دلکش اتنی پرکشش دکھائی نہ دے جتنی عالم بے نیازی میں دکھائی دیتی تھی.........لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔بن سنور کر اور لباس کے معاملے میں اہتمام کر کے تو وہ اور بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔شاید وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کس عالم میں زیادہ اچھی

دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ہر حال میں ہی سراپا قیامت تھی اور اس کی ذات میں ہر عالم میں اک عالم نو دیکھا جا سکتا تھا۔

یہ دیکھ کر توصیف کو اپنے دل کی کسی گوشے میں ایک عجب سے مسرت کا احساس ہوا کہ اس کا شوہر شخصیت کے اعتبار سے اس کے پاسنگ بھی نہیں تھا وہ ناٹے قد کا فربہی مائل سانولا اور کم رو سا شخص تھا عمر میں بھی عورت سے بارہ چورہ برس بڑا معلوم ہوتا تھا۔ خاصی بے جوڑ شادی معلوم ہوتی تھی۔ توصیف نے کئی نہایت خوبصورت عورتوں کے معاملے میں یہی دیکھا تھا کہ ان کی شادیاں بے جوڑ ہوتی ہیں لیکن فرق صرف یہ تھا کہ اسے اس سے پہلے کسی عورت کو دیکھ کر اس کے دل اور ذہن کی دنیا یوں تہ و بالا نہیں ہوئی تھی۔ بچوں کو سوار کرانے کے لئے وہ دونوں میاں بیوی ہی گاڑی سے اتر کر آئے تھے۔

اسطرح توصیف کو آج اسے بنی سنوری حالت میں بھی دیکھنے کا موقع

مل گیا تھا۔ وہ واقع اس حالت میں بھی سرتا پا قیامت تھی لیکن اسکے ساتھ ساتھ توصیف نے اس کے شوہر کو بھی سرتا پا دیکھ لیا اس کی شخصیت واقع اس عورت کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھی۔ اسکی شخصیت میں بس ایک ہی قابل ذکر خصوصیت تھی .... اور وہ دولت وخوشحالی کی چمک تھی جس نے اس کے سانولے چہرے اور دھندلائی ہوئی شخصیت کو بھی ایک مبہم اور بے عنوان کشش پیدا کر دی تھی۔ توصیف کے دل میں ایک طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

عورت دو دن تک صرف بچوں کے ساتھ آئی تھی تب بھی اس نے توصیف کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ آج تو گویا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس اسٹاپ سے بچوں کو سکول بس میں سوار کرانے والے صرف وہی تھے اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق اور بے نیاز تھے۔

عورت کے شوہر نے بھی توصیف کی طرف بالکل توجہ نہیں دی حالانکہ اس روز بھی وہ کئی بار گہری نظر سے عورت کی طرف دیکھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ابھی تو وہ خود پر ضبط کر رہا تھا ورنہ شاید گزشتہ دو دنوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہی دیکھ رہا ہوتا تب ضرور عورت کا شوہر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اپنی بیوی کی طرف مردوں کے دزدیدہ نظروں سے دیکھنے کا تو وہ شاید عادی تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ شوہر موصوف گھر میں موجود ہوتے ہیں لیکن بچوں کو بس میں سوار کرانے بیوی ہی آتی ہے'' توصیف نے دل ہی دل میں سوچا لیکن یہ بہرحال کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔

وہ دونوں میاں بیوی بس کے روانہ ہونے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر مین روڈ پر اسی سمت میں روانہ ہو گئے جس سمت میں توصیف کو اپنے آفس کے لئے جانا ہوتا تھا۔ اگلے چوراہے سے توصیف کو دائیں

طرف مڑنا ہوتا تھا ان میاں بیوی کی گاڑی بائیں طرف مڑ گئی اور کئی منٹ بعد توصیف کو یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ وہ قطعی غیر ارادی طور پر انہی کی گاڑی کے پیچھے چلا آیا تھا وہ چوراہے سے اپنے آفس کی طرف نہیں مڑا تھا بلکہ انہیں کی گاڑی کے پیچھے پیچھے مڑ گیا تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

جب احساس ہوا تو وہ بری طرح چونکا۔ ایک خفیف سے احساس جرم نے اسے گھیر لیا۔ کہیں عورت کے شوہر کو احساس تو نہیں ہو گیا تھا کہ وہ ان کا تعاقب کر رہا تھا؟ کہیں وہ عقب نما آئینے میں اسے دیکھ تو نہیں رہا تھا؟ لیکن پھر اسے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھ کر یہ اطمینان ہوا کہ ان میاں بیوی کی گاڑی کے پیچھے صرف اس کی گاڑی نہیں تھی اور بھی کئی گاڑیاں رواں دواں تھی ابھی زیادہ دن نہیں چڑھا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا لیکن کچھ ایسا کم بھی نہیں تھا کہ خاص طور پر

توصیف کی گاڑی نظر آجاتی مطمئن ہوکر وہ مناسب فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے ہی چلتا رہا۔

وہ دونوں شاید نہایت مطمئن انداز میں گپ شپ کرتے کم رفتار سے جارہے تھے۔توصیف کو بھی رفتار کم رکھنا پڑ رہی تھی۔راستے پر سگنلوں پر خاصی خاصی دیر رکنا پڑ رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ توصیف اپنے دفتر سے دور ہوتا جارہا تھا۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ان کی گاڑی طارق روڈ کے ایک بینک کے سامنے جارکی۔طارق روڈ پر ابھی دکانیں نہیں کھلیں تھی۔توصیف آگے نکلتا چلا گیا۔شاید وہ کسی کام سے یہاں کے بینک میں آئے تھے۔یک دم ہی توصیف کو کچھ حماقت کا احساس ہوا اسے بھلا ان دونوں کے پیچھے آنے کی کیا ضرورت تھی قدرے کھسیاہٹ کے عالم میں وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر اپنے آفس کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس شام آفس سے گھر آتے واپس آتے وقت وہ غیر ارادی طور پر اس گلی سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ ''تھرٹی بی'' کے گیٹ کے سامنے وہی بچی ایک بڑی سی بال بغل میں دبائے کھڑی تھی جسے صبح اس کی ماں اسکے بھائی سمیت اسکول بس میں سوار کرانے آئی تھی۔ گیٹ بند تھا اور بچی یونہی خالی خولی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

توصیف نے گاڑی کی رفتار پہلے ہی کم کر رکھی تھی۔ وہ بچی کے قریب پہنچ تو قطعی غیر ارادی کے انداز سے اس کا پاؤں بریک پر پڑ گیا۔ کھڑکی سے سر نکال کر وہ بچی کی طرف دیکھ کر مشفقانہ انداز میں مسکرایا۔ پھولے پھولے گلابی رخساروں والی وہ معصوم بھولی بھالی لڑکی مسکرادی۔ توصیف نے گیٹ کے دوسرے پلر پر وہ نیم پلیٹ دیکھ لی تھی صاحب خانہ کا نام سکندر علی تھا۔

''بیٹا! آپ سکندر علی کی بیٹی ہیں ناں۔'' توصیف نے ملائمت سے

پوچھا۔

''بچی نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا'' ابو گھر پر ہیں؟۔''

اس اندیشے سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں کہ سکندر علی کہیں بند گیٹ کے پیچھے ہی نہ کھڑا ہو اس کی آواز سن کر باہر ہی نہ آجائے۔

''ابو تو گھر پر نہیں ہیں۔'' بچی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''

یہ سن کر اس کے دل کو کچھ اطمینان ہوا اور وہ سر ہلاتے ہوئے بظاہر سرسری سے انداز میں بولا'' وہ کب تک آجائیں گے بیٹا؟''

'''پتا نہیں......'' بچی نے جواب دیا۔

''اچھا خیر.........'' توصیف نے روانی سے اسی سرسری انداز میں کہا'' میں ان سے فون پر رابطہ کرلوں گا.........فون نمبر کیا ہے بیٹا تمہارا؟''

اسے احساس تھا کہ حالات نے اس دور کے چھوٹے بچوں کو بھی ہوشیار بنا دیا تھا اور والدین بھی گاہے گاہے انہیں مختلف ہدایات دیتے رہتے تھے اس لئے شاید بچی فون نمبر نہ بتائے لیکن وہ بہر حال ایک اچھی گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک معزز اور شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا ،نہایت محبت سے بچی سے بات کر رہا تھا اور شاید بچی نے اسے پہچان بھی لیا ہو کہ وہ اسٹاپ پر آتا تھا۔اسی وجہ سے شاید اس نے کچھ مانوسیت بھی محسوس کی ہو۔بہر حال بچی نے نہایت روانی سے نمبر بتا دیا۔

توصیف کا ذہن جیسے اس وقت کمپوٹر بنا ہوا تھا جس میں وہ نمبر فوراہی محفوظ ہو گیا اس نے مسکرا کی بچی کا شکریہ ادا کیا اور فوراہی گاڑی آگے بڑھا دی۔اس دوران میں اس کا دل تیزی سے دھڑکتا رہا کہ کسی بھی لمحے کوئی گیٹ سے نکل نہ آئے اور اس سے پوچھ نہ لے کہ وہ بچی سے

فون نمبر کیوں پوچھ رہا تھا؟ اس کی تو اس گھر میں رہنے والوں سے کوئی شناسائی نہ تھی۔

اس گلی سے نکل کر وہ گھر جانے کی بجائے ایک دوسری گلی میں مڑ گیا۔

چھوٹے سے پارک کے نزدیک اس نے گاڑی لے جا کر روکی۔

گاڑی کے تمام شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا موبائیل فون نکالا اور وہ نمبر ملایا۔

''ہیلو...........'' چند لمحے بعد نہایت منفرد سی ایک نسوانی آواز سنائی دی توصیف نے ابھی تک اس عورت کی آواز نہیں سنی تھی لیکن صرف ''ہیلو'' سنتے ہی اسے یقین آ گیا تھا کہ یہ آواز اسی کی تھی۔ ایسی خوبصورت اور منفرد آواز اسی کی ہو سکتی ہے۔ آواز بھی گویا دل کھینچ لینے والی تھی۔ یہ آواز ریڈیو اور ٹی وی کی بہت سے اناؤنسر سے بدرجہا بہتر تھی۔

توصیف کا دل گویا ایک بار پھر کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

زبان تالو سے چمٹ کر رہ گئی۔ اس نے نمبر تو ملا لیا تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیا کرے ذہن میں یکدم جیسے آندھیاں سے چلنے لگیں۔

''ہیلو......'' اس بار پہلے سے زیادہ بلند آواز میں کہا گیا اور توصیف کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں وہ اب بھی خاموش ہی رہا۔

''ہیلو.........'' بھئی کون ہے؟ بولئے نا.........'' اس بار قدرے ناگواری سے کہا گیا۔

''وہ......میں.........آپ کیسی ہیں........؟'' توصیف کے حلق سے عجیب بیٹھی بیٹھی آواز نکلی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اس نے اپنے آپ کو قطعی احمق محسوس کیا۔

''میں ٹھیک ہوں........مگر آپ ہیں کون........؟'' لہجے میں ہلکی سی

ناگواری برقرار تھی۔

''وہ.........میں............''وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''کیا آپ کو'وہ میں' کے علاوہ کچھ بولنا نہیں آتا؟''اس خوبصورت آواز میں ناگواری کا رنگ بڑھ گیا۔''

''وہ.........میں.......''ایک بار پھر اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلے اور اس کا دل چاہا کہ موبائیل فون اپنے سر پر دے مارے۔اسکی حالت تو پرائمری یا مڈل میں پڑھنے والے کسی لڑکے سے بھی بدتر تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی عورت سے بات کرتے وقت اس کی یہ حالت ہو جائے گی اور بات بھی روبرو نہیں فون پر ہو رہی تھی۔

''آپ خواہ مخواہ لوگوں کو ڈسٹرب کرنے والے کوئی احمق معلوم ہوتے ہیں''نسوانی آواز میں اب صرف ناگواری ہی نہیں ہلکی سی برہمی بھی

آ گئی تھی پھر کھٹ سے ریسور رکھ دیا گیا۔

توصیف اس سے سو فیصد متفق تھا۔ وہ واقع احمق تھا۔ وہ چند لمحے موبائیل فون کو ہاتھ میں گھورتا رہا۔ سلسلہ منقطع کر کے اس نے ایک بار پھر دی ڈائیل کا بٹن دبا دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجی غنیمت تھا کہ ریسور نیچے نہیں رکھا گیا تھا اس بار دوسری بیل پر ہی ریسور اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو.....'' اس بار نسوانی آواز نے نارمل انداز میں کہا۔ شاید اسے معجزاتی طور پر توقع تھی کہ اس بار فون کرنے والا وہی نہیں ہوگا۔ فوراً ہی دوبارہ گھنٹی بجنے کے باوجود کال کسی اور کی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ خاموش رہا اسے اندیشہ تھا کہ وہ بولا اس کے منہ سے پھر وہی الفاظ نہ نکل جائیں جن کی وجہ سے وہ شرمندہ ہو رہا تھا یعنی ''وہ......میں۔''

''ہیلو.........! وہ دوبارہ بولی تو لہجے میں قدرے تناؤ تھا چند سیکنڈ کے وقفے سے وہ گہری سانس لے کر بولی ''اچھا آپ تو وہی معلوم ہوتے

ہیں.........میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے لوگوں کو رانگ نمبر پر فون کر کے ملتا کیا ہے ! کتنا فالتو وقت ہوتا ہے آپ جیسے لوگوں کے پاس......جسے آپ اس جیسے فضول کاموں میں صرف کر دیتے ہیں۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے اور آپ ابھی یہاں رانگ کالیں کرنے میں لگے ہوئے ہیں.......میں ریسور نیچے رکھ رہی ہوں اب آپ جتنی دیر چاہیں نمبر ملانے کی کوشش کرتے رہیں.......''

اس کے بعد دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔توصیف چند لمحے موبائیل فون کان سے لگائے بیٹھا رہا کہ شاید وہ دوبارہ ریسور اٹھالے اور کچھ بولے.........لیکن دوسری طرف سکوت ہی رہا آخر اس نے سلسلہ منقطع کر کے دوبارہ ری ڈائیل کا بٹن پریس کر دیا تو انگیج کی ٹون سنائی دی۔اس نے گہری سانس لے کر سلسلہ منقطع کیا۔موبائیل جیب میں ڈالا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

عورت نے جو کچھ بھی کہا تھا خفگی سے کہا تھا۔اس کے باوجود توصیف کے دماغ میں جلترنگ سے بج رہے تھے۔اس کی آواز بھی اس کی طرح خوبصورت تھی اس کیلئے تصور کرنا محال تھا کہ یہ اگر اس کے کانوں میں مہربان لفظوں کا رس گھولتی تو اس کا کیا عالم ہوتا شاید فرط مسرت سے اس کے دل کی دھڑکن رک جاتی۔

اس روز وہ گھر پہنچا تو اس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل برپا تھی اس کا کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا دل بس یہی چاہ رہا تھا کہ کسی کونے کھدرے میں گھس جائے اور تصور جاناں کئے لیٹا رہے ......لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اسکی کیفیت کو بیوی تو بیوی کہیں بچے بھی محسوس نہ کرلیں اس لئے وہ ان میں گھل مل کر اپنے معمولات روزمرہ کی طرح رکھتے ہوئے نارمل نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔

رات بستر پر لیٹنے کے بعد وہ دل ہی دل میں اپنی بزدلی پر خود کو لعنت

وملامت کرنے لگا ارادے باندھتا رہا کہ کل صبح وہ ضرور اس کے ساتھ سٹاپ پر کوئی رسمی سی بات کرے گا۔ وہ کچھ سیدھے سادھے سے جملے بھی سوچتا رہا جن کے ذریعے کسی اجنبی خاتون سے بھی بات شروع کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس کے برا ماننے کا اندیشہ نہیں تھا۔

بے شمار لفظوں کو ادھر ادھر کرنے کے بعد اس نے نہایت احتیاط سے تین چار جملے منتخب کئے اور ان کی درجہ بندی بھی کر لی اگر یہ موقع ہوا تو یہ جملہ بولا جائے گا اگر فلاں بات نہ ہوئی تو فلاں جملے کو منسوخ کر دیا جائے گا۔ بہت دیر تک اس ادھیڑ بن میں رہنے کے بعد اسے نیند آئی۔

اگلی صبح وہ اسٹاپ پر پہنچا تو اپنی دانست میں اس نے بڑا حوصلہ مجتمع کر رکھا تھا لیکن جب اس نے گلی سے اس ماہ رخ کو اسی ادائے بے نیازی کے ساتھ برآمد ہوتے دیکھا تو اس کا دل اتھل پتھل ہونے لگا، سوچے

ہوئے جملوں کی ترتیب بدلنے لگی اور پھر وہ جب اس سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر کھڑی ہوئی تو اسکے وجود کی مسحور کن خوشبو اس کے حواس کو دھندلانے لگی تو وہ سارے جملے بھول چکا تھا تاہم وہ ہمت کر کے کسی نہ کسی طرح غیر محسوس انداز میں کھسکتا ہوا اس کے اور قریب ہو گیا۔

چند لمحے سکوت رہا۔ اسے جھجھلاہٹ سی بھی محسوس ہوئی کہ وہ اسطرح بھی تو اس کیطرف نہیں دیکھتی تھی جیسے محض اتفاقاً نظر اٹھ گئی ہو۔ آخر وہ بڑی ہمت کر کے نئے سرے سے حوصلہ مجتمع کر کے بولا۔

''وہ...........میں........''

غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے یہی دو الفاظ نکلے تھے اور آواز کچھ ایسی برآمد ہوئی تھی جیسے کوئی چوہا کسی کے پاؤں تلے آ گیا ہو اس کا دل چاہا کہ تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی کسی گاڑی کے آگے چھلانگ

لگا دے نہ جانے کس طرح سنبھل کر وہ جلدی سے بولا ’’میں یہ کہنے لگا تھا کہ آج بس کچھ لیٹ ہوتی دکھائی دے رہی ہے..........‘‘

دل ہی دل میں وہ دعا کر رہا تھا کہ اس کے پہلے دو الفاظ اس عورت نے سنے ہی نہ ہوں اس کی مرمریں گردن چہرے سے حرکت میں آئی چاندنی اور گلابوں کی رنگت سے گندھا ہوا وہ چہرہ اس کی طرف ہوا ....لمبی لمبی سیاہ پلکوں کی جھالریں اٹھیں اور ان غزالی آنکھوں نے گویا پہلی بار اس کی موجودگی کو محسوس کیا؛ چند لمحے وہ خاموشی سے ایک ٹک کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ توصیف کے دل کی دھڑکنیں گویا رکنے لگیں۔ حلق کچھ اور خشک ہونے لگا۔

اسے احساس ہوا کہ شاید وہ آج ہی اس حقیقت سے آگاہ ہوئی ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کو وہاں چھوڑنے آتا رہا تھا........اور وہ شاید اس بات پر حیران ہو رہی تھی شاید وہ اسے اس درخت کی طرح سمجھ رہی تھی

جو اچانک ہی زمین چیر کر نکل آیا تھا توصیف کو قطعاً امید نہیں تھی کہ وہ ایسی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھے گی اسے بولنے کیلئے اور کچھ نہیں سوجھا۔ بس وہ مسکراتا رہا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ وہ مسکراتے ہوئے اور بھی زیادہ احمق لگ رہا ہوگا۔

آخر اس کے یاقوتی ہونٹ ہلے اور وہی اعصاب میں گدگدی پیدا کرنے والی آواز ابھری ''میں نے سنا ہے کہ یہ بس کبھی لیٹ نہیں ہوتی لیکن اگر ہمارے ہاں کی ٹریفک میں دو چار منٹ لیٹ ہو بھی جائے تو میرے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔''

اس نے نہایت ملائمت سے یہ الفاظ ادا کئے تھے۔ توصیف کی جان میں جان آئی۔ اس کی گردن میں اب تک جیسے کوئی نادیدہ پھندا پڑا ہوا تھا جو لمحہ بہ لمحہ سخت ہوتا جا رہا تھا کہ اب جیسے یک دم ہی وہ پھندا ہٹ گیا اسے آسانی سے سانس آنے لگی۔ دھڑکنیں کچھ اعتدال پر آتی

محسوس ہوئیں۔

اس نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کی کہ وہ خواہ مخواہ ہی اس مرحلے کو اتنا مشکل سمجھتا تھا۔

اس خاتون سے تو بات چیت شروع کرنا اتنا مشکل کام نہیں تھا وہ تو کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے یہ کام پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانے ....

....کے مترادف تھا اس نے دل ہی دل میں دعا کی بس زیادہ نہیں تو دو چار منٹ لیٹ ہو ہی جائے۔

مگر عین اسی وقت بس آ گئی توصیف نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔

وہ بچوں کو بس میں سوار کرا چکے اور بس آگے بڑھ چکی تب بھی عورت مین روڈ کراس کر کے دوسری طرف روانہ نہیں ہوئی۔ وہ اسکی طرف دیکھ رہی تھی ایک عجیب سی مسرت سے توصیف کا برا حال ہونے لگا۔

وہ خود اس سے بات آگے بڑھانے کی خواہش مند تھی وہ خواہ مخواہ ہی

اتنے دن اس سے ڈرتا رہا توصیف نے سوچا اور پھر دل ہی دل میں خود کو ڈانٹ پلائی ''گدھا کہیں کا...........''

''یہ آپ کے اپنے ہی بچے تھے ناں جنہیں آپ نے بس میں سوار کرایا ہے؟'' وہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔

ایک لمحے کے لئے وہ بوکھلا گیا۔ بظاہر سیدھا سادھا اور سنجیدہ سوال تھا لیکن اس میں نا معقولیت بھی تلاش کی جا سکتی تھی۔ تاہم ایک اجنبی خاتوں جو پہلی بار کسی مرد سے مخاطب ہو رہی ہو۔ اس سے ایسی معقولیت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی.......''

''جی ہاں..........'' وہ سنبھل کر بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی میری طرح کافی عرصے سے شادی شدہ ہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''جی ہاں.........'' اس نے گویا قدرے پچھتاوے کیساتھ اعتراف

کیا۔

''پھر تو آپ کو دوسروں کے بچوں سے ان کے فون نمبر معلوم کر کے ان کی ماؤں کو فون کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔'' وہ نیچی مگر غصیلی آواز میں بولی۔

توصیف تو اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا اسے توقع نہیں تھی کہ وہ یکدم ایسی بات کہہ دے گی۔

وہ اب بھی اپنی جگہ کھڑی تھی گھر کیطرف روانہ نہیں ہوئی تھی توصیف کیلئے یہ تو اطمینان کی بات تھی لیکن خفت اور ذلت کا احساس دلانے والی یہ بات تھی کہ وہ غصے اسے اسے گھور رہی تھی اور توصیف کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی صفائی میں کیا کہے۔ آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ جب انسان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا ہو کہ اسے کیا بولنا چاہئے تو اس وقت سچ بول دینا ہی سب سے اچھی بات ہوتی ہے۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے شرمندگی کے ساتھ دھیمی آواز میں بولا'' مجھے غلط نہ سمجھئے گا میں کوئی اوباش یا آوارہ قسم کا آدمی نہیں ہوں اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی کئی برس سے میں اپنے گھر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہا ہوں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں یا بیوی سے میری ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے وہ ایک اچھی عورت ہے اور بہت عمدگی سے گھر سنبھالے ہوئے ہے ایک اچھی بیوی کی طرح اپنی تمام ذمہ داریاں اچھی طرح سرانجام دیتی ہے.........اس کے باوجود.......اس کے باوجود.......... معلوم نہیں مجھے؟''

اس مرحلے پر پہنچ کر اس کی زبان اٹک گئی۔ وہ اب بھی اسے گھور رہی تھی لیکن توصیف نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر غصہ کچھ کم ہو چکا تھا، وہ خواہ کچھ بھی سوچ رہی تھی لیکن یہ بات طے تھی کہ وہ توصیف کی

بات توجہ اور انہماک سے سن رہی تھی توصیف کی کچھ ہمت بڑھی شاید اس کے لہجے میں مچلتا ہوا سچ اثر دکھا رہا تھا۔

وہ ایک دم اسکی طرف بڑھا وہ پیچھے نہیں ہٹی توصیف پہلے سے بھی مدہم آواز میں سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا" اس کے باوجود......... معلوم نہیں یہ مجھے کیا ہو گیا ہے........میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے میری کیفیت خود میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ......میری ایسی حالت تو ہائی سکول کے زمانے میں.......کالج کے زمانے، میں.........یونیورسٹی کے زمانے میں.......غرض یہ کہ کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے اتنے برسوں بعد اس عمر میں آ کر پتہ چلا ہے کہ پہلی نظر میں عشق ہونا کسے کہتے ہیں میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا اس پر مجھے کچھ اختیار نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرتا رہا لیکن لاکھ کوشش کے خود کو باز نہ رکھ سکا......

میں........میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں لیکن بس میں کیا کروں یہ سب کچھ جیسے خود بخود ہو رہا ہے.........میں راتوں کو جاگتا رہتا ہوں.........آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں.....کام میں دل نہیں لگتا.............مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کچھ غلط ہے لیکن....... لیکن مجبور ہوں۔''

عورت کی چہرے پر غصے کی جگہ اب حیرت نے لے لی تھی۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ شاید غیر ارادی سا انداز تھا۔ اسے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ اس کے تاثرات کیا تھے۔

توصیف خاموش ہوا تو اس نے گویا جلدی سے کوشش کر کے اپنے چہرے پر برہمی کا اثار ابھارا۔ اس تبدیلی کو توصیف نے بھی محسوس کرلیا۔ اس کے دل میں خفیف سی گدگدی ہوئی۔ شاید اس عورت نے اپنے اوپر ایک خول چڑھا رکھا تھا شاید وہ اس خول کو چٹخانے میں

کامیاب ہوگیا تھا۔

''آپ مجبور نہیں پاگل ہیں۔'' وہ دھیمی مگر غصیلی آواز میں بولی'' اپنے دل کو قابو میں رکھیئے آپ کا تو شاید کچھ نہیں جائے گا.........ایک شریف عورت کی گھریلو زندگی برباد مت کیجئے۔''

''میں.......میں آپ کو قطعاً کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔کوئی دکھ دینا نہیں چاہتا.........'' وہ جلدی سے بولا آپ کی ذات کو کوئی دکھ پہنچنے سے پہلے تو میں چاہوں گا کہ مجھے موت آجائے۔''

یہ سن کر عورت کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے تغیر سا آ گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ ایک دم برہم سی دکھائی دینے لگی اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی ''لیکن مجھے نقصان تو پہنچ سکتا ہے۔آپ پر تو عشق کے جراثیم یک طرفہ طور پر حملہ آور ہو رہے ہیں لیکن اگر آپ کی حرکتیں میرے شوہر کے علم میں آ گئیں تو انہیں شک ہو سکتا ہے کہ شاید میں نے آپ

کی ہمت افزائی کی تھی وہ شکی مزاج تو نہیں ہیں لیکن ....لیکن پھر بھی ......کیا بھروسہ ! آپ کو کیا ملے گا ایک عورت کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول کے........؟''

''میں نے کہا نا کہ میں ایسا کچھ نہیں چاہتا لیکن.........۔''

''بھاڑ میں گئی آپ کی لیکن ویکن..........''وہ تیزی سے بولی اسے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ اسے بس کے جانے کے بعد بھی وہاں کھڑے کئی منٹ ہو گئے ہیں۔وہ بات ادھوری چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

توصیف دم بخود وہیں کھڑا رہا۔اس کی طرف سے تو ایک قسم کا آغاز ہو گیا تھا اس نے تو اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے اس پر تو خوش ہونا چاہئے تھا یا نہیں.........لیکن کم از کم سکوت تو ٹوٹا تھا بظاہر پرسکون جھیل کی تہہ میں مچلتی ہوئی لہریں سطح

آب پرتو آ ئیں تھی۔عورت کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی کس طرح اچانک.........اور کس حد تک اس کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ذرا بجھے ہوئے دل کے ساتھ اسٹاپ پر پہنچا۔اسے اندیشہ تھا کہ وہ خود بچوں کے ساتھ نہیں آئے گی۔ممکن ہے بچوں کو اپنے شوہر کیساتھ بھیج دے ممکن ہے ملازمہ کیساتھ بھیج دے اس وقت اسے ایک زور دار جھٹکا لگا جب اس نے اسی کو بچوں کیساتھ پہلے ہی اسٹاپ پر کھڑے پایا۔

اس سے بھلا کیا مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا؟توصیف نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا۔کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی برہمی ظاہر کر رہی تھی لیکن دل میں اسکے بھی کچھ کھد بھد ہوئی تھی؟ دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سمجھایا،خواہ مخواہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ممکن ہے اس کا شوہر یہ زحمت کرنے پر تیار ہی نہ

ہوتا اور اصل وجہ وہ اسے فی الحال بتا ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ کیوں سٹاپ پر جانے سے کترا رہی تھی۔

ملازمہ کیسا تھ شاید وہ اس لئے بچوں کو نہ بھیجتی ہو کہ اسے ملازمہ پر اعتبار نہ ہو، اس طرح کے متضاد خیالات میں گھرا ہوا وہ دونوں ہاتھوں سے دونوں طرف ایک ایک بچے کا ہاتھ تھامے اس سے کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

بچوں کی موجودگی میں وہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی طرف دیکھنے سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اس کی طرف سے منہ پھیرے ترچھی کھڑی تھی مگر پھر توصیف نے اسے غیر ارادی اور دزدیدہ سے انداز سے صرف ایک لمحے کے لئے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا اور اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ مگر اس نے فوراً ہی منہ پھیر لیا اور بے نیاز سی بن گئی۔

بچوں کے بس میں سوار ہوتے ہی اس سے پہلے کہ وہ گھر روانہ ہونے کیلیے سڑک عبور کرتی توصیف نے جلدی سے اس کیطرف ایک قدم کھسکتے ہوئے کہا لگتا ہے آپ نے مجھے معاف نہیں کیا........؟ میری اس جرات پر آپ اب بھی خفا ہیں جس پر میرا کوئی اختیار نہیں۔''

''میں ناراضگی یا رضامندی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ میرے پیچھے نہ پڑیں میرے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں۔'' وہ نیچی مگر تیزی آواز میں بولی تاہم اس کے لہجے میں کل والی برہمی نہیں تھی۔ توصیف کا دل امیدی اور ناامیدی کے درمیان لرزنے لگا۔

''میں آپ کے لئے ہرگز کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا میں تو خود مسئلے سے دوچار ہوں۔'' وہ ایک عجیب سے بے بسی محسوس کرتے ہوئے بولا۔ میں آپ کے خیال کو ذہن سے ہر ممکن جھٹکنے کی کوشش کرتا ہوں

لیکن.........گویا یہ میرے بس کی بات ہی نہیں ہے۔''

''آپ کوشش کرتے رہیئے۔'' اس نے قدرے رکھائی سے کہا اور سڑک عبور کرنے کیلئے بڑھ گئی توصیف بت بنا اپنی جگہ کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

اس روز آفس پہنچ کر بھی وہ بے چین رہا۔ کچھ اہم فائلیں اس کی میز پر رکھی تھیں جنہیں اسے دیکھنا تھا لیکن نہیں دیکھنا تو دور کی بات توصیف کا کسی کام کو ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے لئے ہر کام گویا بے معنی سا ہو کر رہ گیا تھا ساری معنویت تو اس دلکش چہرے میں تھی جو اس کے تصور پر چھایا ہوا تھا۔

گیارہ بج گئے.....توصیف نے اندازہ لگایا کہ سکندر علی اس وقت یقیناً اپنے آفس جا چکا ہوگا۔ بچوں کو اس کی بیوی توصیف کے سامنے بس میں سوار کرانے گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ گھر میں اکیلی

ہوگئی۔

اس کا ہاتھ ٹیلی فون کیطرف بڑھنے لگا لیکن اس نے فوراً ہی کھینچ لیا۔ ممکن ہے کسی وجہ سے اس کا شوہر اب تک گھر پر ہی ہو اور اگر اس نے ریسور اٹھا لیا تو؟ یہ خیال اسے فون کرنے سے باز رکھ رہا تھا لیکن مزید آدھے گھنٹے کے بعد گویا اس کی بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔

آخر اس نے ہمت کر کے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور لرزیدہ انگلیوں کیساتھ فون پر اس کا نمبر ملانے لگا جو اس کے دل پر نقش تھا۔ رابطہ ہوتے ہی اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ اس کا شوہر گھر پر نہ ہو اگر وہ گھر پر بھی ہو تو فون کے قریب نہ ہو۔

چوتھی گھنٹی پر ریسور اٹھایا گیا ''ہیلو....'' وہی دل کی تاروں کو چھو لینے

والی مترنم آواز آئی۔توصیف نے سکون کا سانس لیا۔

''میں.........میں بول رہا ہوں۔''توصیف نے اپنا نام بتائے بغیر دھیمے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف گویا بے اختیار ایک گہری سانس لی گئی۔پھر وہ گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے گھٹی گھٹی سرگوشی جیسی آواز میں بولی'' مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ آپ کا فون ہوگا۔میرا دل کہہ رہا تھا۔''

''شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے''وہ جلدی سے بولا۔

''آپ کے دل نے خود ہی اپنی راہ تلاش کی ہوئی ہے اسے دوسرے کے دل سے تو کوئی غرض ہی نہیں ہے۔پتہ نہیں یہ اکثر مرد عشق و محبت کے معاملات میں یک طرفہ ٹریفک ہی کیوں چلاتے رہتے ہیں...........''وہ جلے بھنے انداز میں تیزی سے کہتے چلی گئی...وہ

صرف سانس لینے کیلئے رکی پھر بولی ''آپ کو معلوم ہے کہ چند سیکنڈ پہلے تک میرے شوہر اس کمرے میں موجود تھے اگر وہ فون اٹھا لیتے تو۔؟''

توصیف کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ پہلے ہی فون کر دیتا تو واقعی وہی ہوتا جو وہ کہہ رہی تھی۔ بہر حال توصیف نے جواب دیا

''اگر آپ کے شوہر فون اٹھا لیتے تو میں خاموشی سے فون رکھ دیتا۔''

''آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مرد کو خاموش فون پر بھی شک ہو سکتا ہے؟''

''لیکن وہ اس وقت تک گھر میں کیا کر رہے تھے؟ میں تو سمجھا تھا کہ وہ آفس کے لئے نکل گئے ہوں گے۔'' توصیف بولا۔

ان کا کوئی وقت مقرر نہیں وہ کسی وقت بھی گھر میں، موجود ہو سکتے ہیں اور اگر گئے ہوں تو کسی وقت بھی واپس آسکتے ہیں۔''

''میں چاہتا تو نہیں ہوں کہ آپ کو فون کروں لیکن کیا کروں میری بے

قراری مجھے چین سے نہیں رہنے دیتی.....میں پچھلے آدھے گھنٹے سے خودکو مشکل سے روکے ہوئے تھا۔کوئی لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب میں خودکو نہیں روک پاتا۔آپس سے بات کرنے کو تو ہر وقت ہی جی چاہتا ہے آپ اندازہ نہیں کرسکتی کہ میں خودکو کتنا باز رکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن آخر کار بے بس ہو جاتا ہوں۔''

''بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔''

''یہ میرے اختیار میں کہاں ہے۔''

''بہر حال.........آئندہ مجھے فون مت کیجئے گا۔''

''اچھا کبھی کبھار تو فون کرنے کی اجازت دے دیں۔''

توصیف نے گویا منت کی۔

''نہیں کبھی کبھار بھی نہ کریں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''اگر میرے شوہر کو ذرا سا بھی علم ہو گیا کہ آپ زبردستی میرے پیچھے

پڑے ہوئے ہیں اور مجھے تنگ کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں تو آپ کی ہڈی پسلی ایک کردیں گے۔ ممکن ہے آپ کو گولی ہی ماردیں۔'' وہ شاید اب اسے ڈرانے کی کوشش کررہی تھی۔

'' آپ کی خاطر میں گولی کھانے کو بھی تیار ہوں۔'' وہ سچے دل سے بولا۔

'' ڈائیلاگ نہ بولیں ...... میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کررہی ہوں کسی خطرے سے خبردار کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔'' وہ ذرا غصے سے بولی۔ میرے شوہر سوٹ بوٹ ضرور پہنتے ہیں ڈیفنس میں بھی رہتے ہیں مگر وہ زیادہ پڑھے لکھے اور مرنجاں مرنج یا ضرورت سے زیادہ مہذب آدمی نہیں ہیں۔ وہ اب ٹھیکدار ہیں پہلے وہ لوہے کا کاروبار کرتے تھے ان کے ہاتھ پاؤں اب بھی لوہے کی طرح ہیں۔ وہ بازار میں مار ڈھار کرسکتے ہیں گولی چلاسکتے ہیں ویسے وہ بہت خوش

مزاج ہیں لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں کب کس بات پر غصہ آ جائے۔

''آپ مجھے اپنے شوہر کے بارے میں بتا کر خواہ مخواہ اپنے الفاظ ضائع کر رہی ہیں۔ مجھے آپ کے شوہر کو جاننے میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے میں تو آپ کو..........اور صرف آپ کو جاننا چاہتا ہوں۔''

وہ ملائمت سے بولا۔

''پہلے میرے شوہر کے بارے میں جاننا آپ کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اسے مجھ سے تو واسطہ نہیں پڑے گا لیکن میرے شوہر سے شاید پڑ جائے۔'' وہ بھی رسان سے بولی۔

''جب پڑے گا تب دیکھا جائے گا۔'' توصیف بے پرواہی سے بولا ''فی الحال کم از کم اپنا نام تو بتا دیجئے۔''

''آپ گیٹ پر یقیناً میرے شوہر کی نیم پلیٹ تو ضرور دیکھ چکے ہوں

گے۔ وہ سکندر علی ہیں تو ظاہر ہے میں مسز سکندر علی ہوں۔''

''یہ تو رسمی نام ہوا ناں...... میں آپ کا اصل نام پوچھ رہا ہوں۔''

''میں بتانا نہیں چاہتی' آپ ڈھیٹ آدمی ہیں ویسے بھی کسی نہ کسی طرح معلوم کرلیں گے....... جیسے آپ نے فون نمبر معلوم کرلیا۔''

وہ ایک لمحہ خاموش رہا۔ وہ اس سے گفتگو بھی کررہا تھا اور اس کے ذہن کا ایک گوشہ اس گفتگو کا تجزیہ بھی کررہا تھا۔ وہ اب پہلے جیسا نروس نہیں رہا تھا۔ وہ یہ نوٹ کئے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ عورت بھی خاصی دیر سے اس سے بات کئے جارہی تھی۔ اگر وہ اس سے اتنی ہی بیزار تھی جتنا کہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہی تھی تو وہ فون بند بھی کرسکتی تھی شوہر کے بارے میں وہ جو باتیں کررہی تھی توصیف یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سب کی سب ٹھیک تھیں یا وہ محض افسانہ طرازی اور مبالغہ آرائی ہی کررہی تھی اور ان باتوں کا مقصد واقع اسے خبردار کرنا اور

اسے ڈرانا تھا یا پھر یہ محض بات کو طول دینے کا بہانہ تھا؟۔

ابھی کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن بہرحال توصیف کے لئے تو یہ بھی بہت تھا کہ اس نے بات تو ہونے لگی تھی بھلی یا بری.....

.......کچھ تو بات ہوتی تھی اس کی آواز تو سننے کو ملتی تھی لیکن پھر اس نے محسوس کیا بات چیت جتنی ہمت شکن تھی اس کی آتش شوق اتنی ہی زیادہ بھڑک رہی تھی۔وہ اپنی دانست میں شاید اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے جتنی سخت اور روکھی باتیں کر رہی تھی اس کا دل اور بھی اس کی طرف کھینچا چلا جا رہا تھا گویا اس کے مرض کی یہ دوا نہیں تھی اسے ٹھکرا دیا جاتا اسے سمجھایا جاتا اسے ڈرایا جاتا۔اس کا مرض تو کچھ اور مانگتا تھا۔وہ خود حیران اور پریشان تھا کہ وہ کس مرض میں مبتلا ہو گیا تھا؟ کیا عشق ایک وائرس کی طرح بھی دماغ میں گھس جاتا ہے؟ کیا عشق اس سمجھداری کی عمر میں بھی انسان کو اس طرح عقل و خرد اور

سنگدل

خدا نے اس سے نرم کوئی شے نہ بنائی جو ہر لمحے تاحیات انسان کو زندہ رکھنے کے لئے دھڑکتا ہے مگر اس سے زیادہ سنگدل بھی کوئی شے نہیں، جو دھڑکنا بند کر دیتا ہے۔ایک سنگ شخص کی کہانی......

نفع ونقصان کے خیال سے بے نیاز کر سکتا تھا۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' وہ کہہ رہی تھی۔

وہ چونکا اور سنبھل کر بولا'' سب سے پہلے تو میں کہیں، کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر آپ کے ساتھ دنیا جہان کی باتیں کرنا چاہتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میری روح صدیوں سے آپ کیساتھ باتیں کرنے کیلئے ترس رہی ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔''

''کیوں.........آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔''

''بس.......دوسری طرف سے اس کی بات کاٹی گئی۔اس نے ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔'' یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی کھٹ سے ریسور رکھ دیا۔

توصیف کئی لمحے ریسور کان سے ہی لگائے اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا پھر

اس نے نہایت آہستگی سے ریسور رکھا اور دوبارہ نمبر نہیں ملایا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے بارے میں صرف اسی کے بارے میں لمحہ بہ لمحہ اس کی یہ سوچ پختہ ہوتی جا رہی تھی کہ وہ اس عورت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

لنچ بریک کے بعد تین بجے کے قریب اسے پھر خیال آیا کہ فون کرنا چاہیے۔ درحقیقت خیال تو اس کے ذہن میں ہر وقت ہی موجود رہتا تھا' یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ کوئی لمحہ آتا تھا جب اس کے لئے اس خواہش پر قابو رکھنا ممکن نہیں رہتا تھا۔ تیسری گھنٹی کے بعد ریسور اٹھایا گیا اور وہی آواز سنائی دی جسے سننے کیلئے اس کے کان ترستے تھے۔

''ہیلو.....''

وہ ایک لمحہ خاموش رہا تو گویا وہ سمجھ گئی کہ دوسری طرف کون تھا۔ آہستگی سے بولی ''اوہ......!'' پھر ذرا بلند آواز میں بولی ''رانگ نمبر۔''

ریسیور رکھ دیا گیا۔

اسے اندازہ تو ہو گیا کہ شاید اس کا شوہر گھر پر موجود تھا۔

اس کے باوجود وہ چند سیکنڈ بعد نمبر ملائے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہیلو.........'' دوسری طرف سے ایک بھاری گونجیلی مردانہ آواز سنائی دی اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا اور کئی لمحے ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اس نے نمبر نہیں ملایا۔

دوسرے روز وہ پھر اسٹاپ پر موجود تھی اس روز توصیف کے پہنچتے ہی اس نے خفگی آمیز سی نظروں سے اس کیطرف دیکھا اور فوراً ہی منہ پھیر لیا۔ بچوں کو سوار کراتے ہی وہ اس کی طرف مڑی۔ وہ گویا خود اس سے بات کرنے کیلئے موقع کی منتظر تھی۔

''کیا آپ باز نہیں آئیں گے؟'' وہ نیچی آواز میں ناراضگی سے بولی۔

''کس بات سے؟'' توصیف نے معصومانہ اور انجان بننے کی کوشش

کی۔''

''ایسے بھولے نہ بنیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا مطلب کیا ہے۔ آپ میرے گھر میں فون کرنے سے باز نہیں آئیں گے؟ آخر آپ کو کیا ملے گا ایک شریف عورت کی زندگی میں زہر گھول کر؟ آخر میں آپ کو کیسے سمجھاوں کہ اب آپ کی یہ حرکتیں کرنے اور میری ان حرکتوں میں دلچسپی لینے کی عمر نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں بے بسی جھلک آئی۔

''میں..........میں کب چاہتا ہوں کہ آپ کی زندگی میں زہر گھلے ....میں تو آپ کو اس سے بھی زیادہ خوش اس سے بھی زیادہ مگن اس سے بھی زیادہ بہتر حال میں دیکھنا چاہتا ہوں میں آپ کا خیر خواہ ہوں........ بدخواہ نہیں۔''

''یہ اچھی خیر خواہی ہے۔ اسکی آواز گویا گلے میں اٹکنے لگی تو صیف نے

محسوس کیا کہ وہ دھیرے دھیرے اندر سے ٹوٹ رہی ہے' بکھر رہی ہے۔شایداس کی پرسکون اور خوش وخرم ازدواجی زندگی ایک خوشنما خول میں تھی جواس نے اپنے دل کی کائنات کو چھپانے کیلئے اپنے اوپر چڑھایا ہوا تھا۔اندر کے منظر شاید کچھ اور تھے خواہشوں کی دنیا شاید اس کی بھی مختلف تھی لیکن اس نے اس حقیقت کو زندگی کے کسی موڑ پر بھلا دیا تھا۔اس احساس کو کہیں دفن کر دیا تھا۔

''میں.......میں کیا کروں میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''توصیف کے لہجے میں انتہا درجے کی مجبوری اور بے بسی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔''

اس کے لہجے میں اب توصیف سے بھی زیادہ بے بسی اور لاچاری سی جھلک نظر آئی تھی۔

میں بالکل عام سا آدمی ہوں لیکن میرے ساتھ شاید ایک خاص سی گڑ

بڑ ہوگئی ہے۔'' وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا'' بعض واقعات کچھ تاخیر کیساتھ رونما ہوتے ہیں جیسے بعض لوگوں کو کوئی کامیابی کافی بڑی عمر میں آ کر ملتی ہے کوئی ترقی' کوئی پروموشن ملنے میں کسی وجہ سے دیر ہو جاتی ہے انہیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انہیں تو بہت پہلے اس مقام پر ہونا چاہئے تھا۔''

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ وہ قدرے حیران سی آنکھوں سے اس کیطرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا'' میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہو گیا ہے کوئی عمل ہے جو بہت تاخیر سے ہو رہا ہے۔ کوئی واقعہ ہے جو میرے ساتھ اصل وقت سے بہت بعد میں پیش آ رہا ہے......وہ شدید اور جذباتی عشق جو مجھے جوانی یا یوں کہیے نوجوانی میں کسی سے ہونا چاہئے تھا وہ اب ہو رہا تھا وہ جیسے انگریزی میں کہتے

ہیں ناAction Delayed تاخیر سے وقوع پذیر ہونے والا عمل۔ شاید یہ وہی ہے۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اس میں میرے ارادے کو ہرگز دخل نہیں میں جان بوجھ کر یہ سب کچھ ہرگز نہیں کر رہا۔"

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا اور ایک ٹک اس کیطرف دیکھنے لگی۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر سوچ اور تشویش کی شکنیں تھیں۔

توصیف کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا وہ ذرا دیر مسلسل اسکی طرف دیکھتا رہا تو اس کا سینہ دھونکنی کی طرح مچلنے لگتا تھا جیسے وہ میلوں دوڑ لیا ہو۔ آخر ایسی کیا بات تھی اس عورت میں؟ شاید بات اس میں نہیں تھی اس کی اپنی ذات میں کوئی گڑبڑ تھی۔ شاید اس کے اپنے میکنزم کو کوئی بٹن غلط دب گیا تھا شاید اسکے دماغ میں اس کے نظام میں کوئی خلل آ گیا تھا۔

"میں اپنا فون ہی کٹوا دوں گی یا نمبر ہی بدلوا لوں گی۔" آخر وہ بولی۔

''اس سے کیا ہوگا؟ میں نیا نمبر بھی معلوم کرلوں گا۔''

''میں اپنے شوہر سے کوئی بات بنا کر یہ گھر ہی بدل لوں گی علاقہ ہی بدل لوں گی ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔''

''میں آپ کو ڈھونڈتا ہوا وہاں بھی آ پہنچوں گا خواہ اس میں برسوں لگ جائیں۔'' وہ بڑے یقین سے بولا۔

''خدا کی پناہ......'' اس کی حیران حیران سی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔'' آپ تو واقعی کسی بھوت کیطرح میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔'' وہ نہایت شستہ اردو...........اور شائستہ لہجے میں بات کرتی تھی۔

''محاورتاً کہا جاتا ہے نا............کہ فلاں کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوگیا ہے...........میں وہی بھوت ہوں........میں عشق میں ہوں...........میں سرتاپا عشق ہوں۔''

”لیکن مجھے یک طرفہ عشق کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو آپ سے عشق نہیں ہے آپ اپنے عشق کو سنبھال کر چھپا کر اپنے آپ تک محدود کیوں نہیں رکھتے؟ اس سے مجھے کیوں پریشان کرتے ہیں؟“ وہ اب کافی حد تک نرم لہجے میں سمجھانے والے انداز میں بات کر رہی تھی۔

”عشق اپنا اظہار چاہتا ہے اظہار کے بغیر نہیں رہ سکتا اور آپ کبھی تنہائی میں اپنے دل کو بہت گہرائی تک بھولی بسری سوچوں کے تاریک صنم خانوں میں ٹٹول کر دیکھنے لگا شاید آپ کو ایسے عشق کی طلب ایسی خواہش کی کوئی چنگاری کہیں راکھ تلے دبی ہوئی مل جائے شاید آپ کے محسوسات بدل جائیں۔ شاید آپ کو کسی حد تک میرے محسوسات کا اندازہ ہو جائے۔“ نہ جانے توصیف کے دل میں کیسے ایک عجیب سا گداز آ گیا۔ خوبصورت الفاظ خود بخود اس کے زبان

سے پھسلتے گئے۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دے...... کسی دل شکستہ و نامراد بچے کی طرح!

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور وہ جانے کے لئے قدم بڑھاتی ہوئی تیزی سی بولی ''میں ایسی فضول باتیں سننا نہیں چاہتی۔'' اور پھر چلی گئی۔

گیارہ بجے توصیف نے دفتر سے اس کے ہاں فون کیا۔ دوسری طرف سے فون اٹھانے والی عورت کے لب و لہجہ سے معلوم ہوا کہ فون اٹھانے والی ملازمہ تھی۔

''ذرا بی بی جی سے بات کراؤ۔'' اس نے ہلکے رعب سے کہا۔

''بی بی جی........ آپ کا فون ہے۔'' فون پر ملازمہ کی آواز سنائی دی۔

''نام پوچھو کون ہیں؟'' پس منظر سے اس کی ہلکی آواز سنائی دی۔ وہ

شاید ٹیلی فون سے کچھ دور تھی۔"

"آپ کا نام کیا ہے جی؟" ملازمہ اب توصیف سے مخاطب ہوئی۔

"بی بی جی سے کہو کہ بچوں کے اسکول سے فون ہے۔" توصیف نے نام بتانے کی بجائے کہا۔

"بی بی جی ! بچوں کے اسکول سے فون ہے۔" ملازمہ نے ایک بار پھر باآواز بلند اطلاع دی اور وہ جلد ہی فون پر آ گئی۔

"ہیلو.......!" وہ محتاط انداز میں بولی۔

"معافی چاہتا ہوں' آپ سے بات کرنے کیلئے غلط بیانی کرنی پڑی۔" توصیف حقیقتاً معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

اس نے گویا سینے میں اٹکی ہوئی ایک طویل سانس خارج کی پھر غالباً ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ملازمہ کو آواز دی "تم پہلے باہر کی صفائی کر لو......" توصیف کو یہ مدہم سی آواز بھی سنائی دے گئی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "مجھے معلوم تھا کہ یہ آپ کا ہی فون ہوگا۔"

اگر اسے واقع معلوم تھا اور اس کے باوجود وہ فون سننے آ گئی تھی تو کیا اسے حقیقی برہمی اور ناپسندیدگی کہا جا سکتا تھا؟ یہ سوال پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ اس کی بجائے وہ بولا "دیکھئے.........جب آپ کو اندازہ ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح آپ کا اصل نام معلوم کر ہی لوں گا تو آپ مجھے خود ہی کیوں نہیں بتا دیتیں؟"

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد غیر متوقع طور پر ٹھہرے لہجے میں بولی "میرا نام نایاب ہے اگر آپ کہیں تو میں اپنے بارے میں ہر بات اپنے مکمل کوائف بلکہ اگر آپ کہیں تو اپنی زندگی کی پوری کہانی لکھ کر آپ کو دے دوں؟

اس سے آپ کو میرے بارے میں ہر بات معلوم ہو جائے گی کیا اس

کے بعد آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں گے؟

''نہیں......اس نے بلا تامل جواب دیا'' بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد میں آپ سے زیادہ محبت کرنے لگوں میرا عشق زیادہ شدید ہو جائے۔

''اچھا ایک بات بتائیں۔'' اس نے بڑے رسان سے کہا'' جی پوچھیئے ضرور پوچھیئے۔'' توصیف کا انداز والہانہ تھا۔

''اپنے ایمان سے.......سچ سچ بتایئے گا.....اگر یہی حرکتیں آپ جو میرے ساتھ کر رہے ہیں اور یہی باتیں اگر کوئی آپ کی بیوی سے کرنے لگے اس طرح کوئی اس کے پیچھے پڑ جائے تو آپ کے جذبات کیا ہوں گے؟''

توصیف کو دھچکا سا لگا۔ اس پہلو پر تو اسنے سوچا ہی نہیں تھا لیکن یہ ایک حقیقت پسندانہ سوال تھا اور دنیا ایک کارخانہ حقائق تھی۔ انسان جو کچھ

بھی دوسروں کے ساتھ کرتا ہے وہ ااس کے اپنے ساتھ بھی تو ہوسکتا ہے۔اس طرف اس کا ذہن کیوں نہیں جاتا؟ یہ عالم مکافات ہے۔ ازل سے جاری ہے۔

توصیف خود بھی حقیقت پسند آدمی تھا۔اس کے ایک حقیقت پسندانہ سوال کیا گیا تھا وہ اس کا جذباتی جواب نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ جواب ہی دینا چاہتا تھا۔جذبات میں سچ کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔

وہ ایک لمحہ خاموش رہا تو دوسری طرف سے وہ استہزائیہ لہجے میں بولی

''دیکھا.........بات کیسی دل کو لگی۔''

یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟ میری بات سن کی آپ خاموش کیوں ہو گئے؟''

دراصل میں اپنا تجزیہ کرر ہا تھا۔'' وہ ملائمت سے بولا'' اصل بات جاننے کی کوشش کرر ہا تھا۔''

''تو پھر کیا پتہ چلا؟'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں دراصل اس بات سے لاعلم رہنا پسند کروں گا۔

سب سے بڑا عذاب تو آگہی ہے انسان کی لاعلمی میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے اسے کوئی اذیت نہیں پہنچتی۔'' توصیف نے دیانتداری سے کہا۔''

اب گویا اس کے خاموش ہونے کی باری تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی تو توصیف کو شبہ ہوا کہ کہیں وہ رسیور نیچے رکھ کر تو نہیں چلی گئی۔

''نایاب....!'' اس نے دھیرے سے پکارا۔

''جی...........!'' دوسری طرف سے اس کی آواز گویا سوچ کے سمندر سے ابھری۔ چاہے وہ غیر ارادی طور پر اس طرح سے بولی تھی لیکن بہر حال اس کا لہجہ مختلف تھا........ بہت مختلف تھا! توصیف کے دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔

"نایاب.......! آپ مان کیوں نہیں لیتی کہ آپ کے دل میں بھی میرے لیئے کچھ ہے........کچھ نہ کچھ ہے.........خواہ وہ کتنا ہی مبہم اور معمولی ہے.....کوئی دھندلا سا خیال........کوئی مبہم سا احساس آپ اپنے دل کو ٹٹولیں تو سہی۔" یہ کہتے ہوئے توصیف کے اپنے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔"

مگر دوسری طرف سے اس نے کلک کی ہلکی سی آواز سن کر اسے دھچکا لگا دوسری طرف سے ریسور رکھ دیا گیا تھا اس نے گہری سانس لے کر چند سیکنڈ بعد ری ڈائل کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر ریسور نہیں اٹھایا گیا آخر توصیف نے فون بند کر دیا اور کام میں دل لگانے کی کوشش کرنے لگا......لیکن اس کا دل تو کہیں اور اٹکا ہوا تھا اس کے ذہن میں بس ایک ہی نام گونج رہا تھا نایاب.......نایاب ....نایاب.......!"

کتنا منفرد نام تھا۔ بالکل اسی کی طرح۔ توصیف نے جب پہلی بار اسے دیکھا تھا.......... پھر اس کی نغمگین آواز نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا اور اب اس کا خوبصورت نام اس کے حواس پر چھا گیا تھا۔ توصیف گویا درجہ بہ درجہ اس وجود کے سحر کا اسیر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مسلسل اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ دن کے باقی حصے میں اسنے دو مرتبہ پھر کوشش کی لیکن دوسری طرف سے فون انگیج ملا۔ ممکن ہے رسیور نیچے رکھ دیا گیا ہو۔

دوسرے روز وہ اسٹاپ پر پہنچا تو ایک بار اس اندیشے سے اس کا دل لرز رہا تھا کہ وہ اب نہیں آئے گی۔ بچوں کو کوئی اور لے کر آئے گا ......اور جب وہ اسٹاپ پر پہنچا تو وہ واقع وہاں موجود نہیں تھی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی وہ بچوں کے ہاتھ تھامے گلی سے نکلتی دکھائی دی۔ کسی انجانی سی تاریکی میں ڈوبتا ہوا اسکا دل یکدم جیسے روشنیوں کی دنیا میں

لوٹ آیا۔اب صرف اسے دیکھ کر ہی توصیف کو صحیح معنوں میں احساس ہوتا تھا کہ زندگی کسے کہتے ہیں۔

وہ آئی اور خاموشی سے اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوگئی۔ایک دو مرتبہ اس نے توصیف کی طرف دیکھا۔نہ جانے کیوں توصیف کو اسکی آنکھوں اور اسکے چہرے پر اداسی پھیلی دکھائی دی۔

''کیا وہ میری وجہ سے اداس ہے؟''توصیف نے ایک عجب سے احساس جرم کے ساتھ سوچا مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس کی وجہ سے وہ پریشان تو ہوسکتی تھی لیکن اداس ہونا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ اس کے اپنے حالات میں بھی کوئی ایسی بات ہوسکتی ہے جو اس کیلئے اداسی کا باعث بن سکتی ہو۔مگر پھر توصیف نے خود کو سمجھایا کہ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی۔اداسی کا کیا ہے......ہر انسان خواہ اسکے حالات کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔کبھی نہ کبھی

..........کسی نہ کسی وجہ سے اداس ہو ہی جاتا ہے۔ غم اور خوشی کی طرح اداسی بھی زندگی کا ایک حصہ تھی۔

اس کی اداسی آج بات کرنے کے لئے بہت اچھا موضوع بن سکتی تھی لیکن بچوں کو بس میں سوار کراتے ہی وہ توصیف کی طرف دیکھے بغیر سڑک کراس کرنے کیلئے چل دی........توصیف جلدی سے اس کے پیچھے لپکا "نایاب........! سنئے"

مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی رکی۔ توصیف نے اس کا مزید پیچھا نہیں کیا۔ کوئی آتا جاتا راہ گیر یا کوئی شناسا اسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ قدرے خجالت کے سے عالم میں اپنی گاڑی کی طرف لوٹ آیا۔

اس روز بھی اس نے گیارہ بجے اپنے آفس سے فون کیا۔ اپنی دانست میں اس نے فون کرنے کا یہ وقت مقرر کرلیا تھا۔ فون نایاب ہی نے

اٹھایا اور بجھی بجھی سی آواز میں ہیلو کہا۔

''آج آپ اتنی اداس کیوں تھیں؟'' توصیف بلا تمہید بولا۔

''آپ سے کس نے کہا کہ میں اداس تھی؟'' اس نے بھی سوال کیے بغیر پوچھا کہ وہ کون بول رہا تھا اور کس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی بہت اچھی طرح اس کی آواز پہنچاننے لگی تھی۔

''یہ بات کسی کو بھی مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا......'' وہ بولا۔

''آپ کی آنکھیں آپ کو دھوکہ دے رہی ہوں گی بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ اکثر ہی آپ کو دھوکہ دیتی ہیں۔ نایاب ہموار لہجے میں بولی۔

میرے خیال میں تو آپ خود کو دھوکہ دے رہی ہیں۔ جو بات سچی ہوتی ہے آپ اسے تسلیم کیوں نہیں کرلیتیں؟''

''آپ مجھ سے وہ باتیں تسلیم کروانا چاہتے ہیں جسے آپ سچ سمجھتے

ہیں۔سچ کے بارے میں ہر شخص کا زاویہ نظر مختلف ہوتا ہے ضروری نہیں کہ جو چیز ایک کی نظر میں سچ ہو وہ میرے نزدیک بھی سچ ہو۔ ....بلکہ یہ سرے سے ہی ضروری نہیں کہ وہ سچ ہو۔'' وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی اور اس کی انداز گفتگو اس کی سوچ نے بتا دیا کہ وہ صرف حسین ہی نہیں ذہین بھی اتنی ہی تھی جتنا توصیف نے اس کے بارے میں اندازہ لگایا تھا۔

''چہرہ روح کا آئینہ ہوتا ہے اور اداسی چہرے پر لکھی دکھائی دے جاتی ہے۔'' توصیف بولا۔

''چہروں پر نہ جایا کریں توصیف صاحب! چہرے اکثر دھوکہ دیتے ہیں۔'' نایاب کے لہجے میں بھی ہلکی سی افسردگی تھی۔

توصیف بری طرح چونکا۔اسے یاد تھا کہ اس نے ابھی تک نایاب کو اپنا نام نہیں بتایا تھا۔اس نے کبھی پوچھا ہی نہیں تھا۔وہ جلدی سے بولا

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''یہ ایسی کون سی مشکل بات ہے۔ آپ چند گھروں کے فاصلے پر ہی تو رہتے ہیں اور آپ کے گھر پر نام کی تختی بھی لگی ہوئی ہے۔'' اس کے لہجے سے اب افسردگی دور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جاننے کی کوشش تو کی تھی؟'' وہ ایک انجانی سی مسرت محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''جی نہیں.... آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیے یہ سب اتفاق سے معلوم ہو گیا تھا۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ اب اس کا لہجہ قطعاً معاندانہ نہیں تھا۔

''اس اتفاق کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں میں؟'' توصیف نے بات آگے بڑھائی۔

''میں فون بند کر رہی ہوں۔''

''کک.........کیوں؟ وہ اچانک بوکھلاہٹ میں ہکلا گیا۔

''بس میں زیادہ لمبی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' نایاب نے جواب دیا لیکن فون بند نہیں کیا۔

چند سیکنڈ کے انتظار کے بعد وہ احتیاطاً بولا'' پلیز فون بند مت کیجئے گا ....میں کوئی بے ہودگی تو نہیں کر رہا۔کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کر رہا آخر مجھ سے بات کرنے میں کیا حرج ہے؟''

''اگر حرج نہیں ہے تو یہ کچھ ضروری بھی نہیں ہے۔''

''ضروری ہے نایاب.....!''

''نہیں کوئی ضروری نہیں۔''

''ہوسکتا ہے کہ آپ کی نظر میں ضروری نہ ہو لیکن میرے نزدیک جیسے یہ زندگی کا سب سے ضروری کام بن گیا ہے۔اگر آپ میری طرف توجہ نہیں دیں گے' کبھی التفات سے بات نہیں کریں گی تو یقین کریں

میں رفتہ رفتہ ذہنی خلجان میں مبتلا رہ کر مر جاؤں گا۔ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی...... میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ کوئی کام مجھ سے ٹھیک طرح نہیں ہوتا۔''

''اور اگر آپ نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو یہی حال میرا ہوگا'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اسطرح ایک نہیں دو زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔ آخر آپ میری باتیں سن کیوں نہیں لیتیں؟ ہم دونوں کی حالت کا واحد علاج یہی ہے کہ ہم کہیں بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں اپنا اپنا دل کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''میری تو فی الحال ایسی کوئی حالت نہیں ہے جس کے لئے میں تشویش محسوس کروں......... اور نہ ہی میں اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھنے کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ آپ کیوں زبردستی مجھے اپنے

ساتھ شامل کیئے جا رہے ہیں؟''

اس کے لہجے میں التفات تو اب بھی نہیں تھا لیکن برہمی یا ناراضگی کا بھی شائبہ تک نہیں تھا۔ بلکہ شاید اس کے ساتھ باتوں میں الجھ کر وہ اپنی افسردگی بھول گئی تھی۔

''مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب آپ کو اپنی زندگی میں شامل کیئے بغیر میں زندگی نہیں گزار سکوں گا۔ آخر آپ کو مجھ پر رحم کھانا چاہیئے۔''

''سب سے پہلے تو میں خود پر رحم کھاؤں گی اور آپ سے بھی میری درخواست ہے کہ آپ اپنے آپ پر رحم کھائیں۔ اس سے آگے بھی رحم کھانے کا کوئی مسئلہ درپیش ہو تو میں آپ سے ہی کہوں گی کہ آپ مجھ پر رحم کھائیں۔ اس معاشرے میں عورت کی پوزیشن زیادہ قابل رحم ہوتی ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہی تھی جیسے کسی ضدی بچے کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔

''لیکن آپ کے معاملے میں تو میں خود کو زیادہ قابل رحم محسوس کر رہا ہوں۔ توصیف کہیں زیادہ بے چارگی سے بولا ''اگر آپ نے مجھ سے ملاقات نہ کی تو میری مکمل تباہی.........شاید میری موت کی بھی ذمہ دار آپ ہی ہوں گی''۔

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئی۔ شاید وہ اس کے لہجے کے یقین کو محسوس کرتے ہوئے گم صم سی ہوگئی تھی۔ پھر وہ محتاط سے لہجے میں بولی ''اگر آپ مجھ سے کچھ باتیں کرنا ہی ضروری سمجھتے ہیں اگر آپ کے خیال میں آپ کی دیوانگی کا علاج یہی ہے اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھ سے باتیں کر کے آپ کو قرار مل جائے گا تو آپ فون پر ہی کر لیجئے۔''
اس کا لہجہ محتاط ضرور تھا لیکن اس میں نرمی تھی۔

توصیف کا دل ایک عجیب سی مسرت سے کانپنے لگا۔ یہ بھی ایک مرحلہ تھا۔ یہ بھی ایک فتح تھی۔ وہ اس سے نرمی سے بات تو کرنے لگی

تھی۔اس کی ''بہت سی'' باتیں سننے پر آمادگی تو ظاہر کر رہی تھی۔ یہ بھی کچھ کم تو نہیں تھا ابتداء میں تو اسے کچھ یوں لگا جیسے وہ اس بت سے سر پھوڑ کر مر جائے گا۔

مگر اس میں گداز پیدا نہیں ہوگا۔

''نہیں......وہ باتیں میں فون پر نہیں کر سکتا۔'' وہ کسی ضدی بچے کے انداز میں بولا۔

''آخر ایسی کیا باتیں ہیں؟'' وہ نہایت تحمل سے بولی۔ اگر وہ غیض وغضب اور برہمی کا اظہار کر سکتی تھی تو غضب کی جگہ تحمل مزاجی کا مظاہرہ بھی کر سکتی تھی۔

''سچ پوچھیں تو باتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔'' اس نے واقعی سچ بول دیا۔

''میں تو آپ کو سامنے بٹھا کر جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس دوران میں اگر کچھ باتیں سوجھ گئیں تو وہ بھی کرلوں گا۔ صبح آپ چند منٹ کے

لئے نظر آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں سے پیاس کے صحرا میں بھٹکے ہوئے بدنصیب کے ہونٹوں سے ایک لمحے کیلئے پانی کا گلاس لگا کر ہٹا لیا گیا ہو۔"

"آپ تو واقع دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا ضرور کوئی دماغی پرزہ گرا ہوا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ نہ جانے کیوں توصیف کو شبہ ہوا کہ شاید اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ گویا چشم تصور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دنیا میں آج تک جو بھی غیر معمولی عشق میں گرفتار ہوا ہے اسے دنیا والوں نے یہی نام دیا ہے.... دیوانہ........ مجنوں........ پاگل وغیرہ۔ آئی ڈونٹ مائنڈ........ اور آپ کے منہ سے تو اپنے آپ کو دیوانہ سننا بھی بہت بھلا لگتا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ وہ شاید اب اس کے جذبے کی شدت کے سامنے

لاجواب ہوتی جا رہی تھی۔ تاہم رسیور اس نے اب بھی نہیں رکھا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد وہ بولا "تو پھر آپ مجھ سے کہاں مل رہی ہیں۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ سے مل رہی ہوں؟" وہ ملامت سے بولی۔

"پلیز......." اس نے منت کی "مجھ سے ملنا آپ کیلئے کسی پریشانی اور الجھن کا باعث نہیں بنے گا...... آپ کو کوئی ندامت کوئی خفت اٹھانی نہیں پڑے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھی مجھ سے مل کر خوش ہونگی وہ غیرارادی طور پر گڑگڑانے والے انداز میں کہتا چلا گیا۔

وہ کئی منٹ تک اس کی منت کرتا رہا جو بھی بہترین الفاظ اس کے ذہن میں آتے رہے ان کی لڑیاں پروتا رہا۔ وہ خاموش تھی بالکل خاموش۔ نہ اقرار نہ انکار۔ شاید سوچ میں پڑ گئی تھی۔ یہ بھی فتح کا ایک اور مرحلہ تھا جو وہ سر کر رہا تھا۔ سوچ میں پڑ[illegible]ت کی نشانی تھی کہ اس کے

دل میں اس درخواست کیلئے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا۔

آخر وہ بولی" مجھے سوچنے کا موقعہ دیجئے میں کل آپ کو سٹاپ پر بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے........ بالکل ٹھیک ہے۔" فرطِ مسرت سے اس کے الفاظ میں لرزش آ گئی۔ اس نے ریسیور رکھا تو خوشی سے اس کا رواں رواں ناچ رہا تھا آخر اس کا جذبہ رنگ لے ہی آیا صرف چند دنوں میں ہی تو بات یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن یہ چند دن اتنے صبر آزما تھے کہ اسے برسوں پر محیط محسوس ہو رہے تھے۔

اب اس کے سامنے کل تک کا وقت گزارنے کا مسئلہ تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کل تک اس کا جواب نہیں سنے گا، تب تک نہ سو سکے گا۔ ایک انجانے ہیجان اور اضطراب سے اس کی بری حالت تھی۔

......لیکن وقت کا کام گزرنا ہے سو گزر گیا۔

کھینچ تان کر اس نے صبح کو شام کیا اور شام کو صبح کیا۔

مقررہ وقت پر وہ دھڑکتے دل کیساتھ اسٹاپ پر پہنچا۔ وہ حسب معمول ایک ادائے بے نیازی سے آئی لیکن اب اس کے چہرے پر بلا کا ٹھہراؤ تھا شاید وہ فیصلے پر پہنچ گئی تھی اور پرسکون تھی۔ ایک نئی بات یہ تھی کہ آج وہ توصیف سے نظر نہیں چرا رہی تھی۔ توصیف تو اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا لیکن بس آنے سے پہلے اس نے بھی کئی بار توصیف کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں جھیل کی طرح پرسکون تھیں لیکن ان میں اس کے فیصلے کا عکس پڑھنا مشکل تھا۔

اس روز توصیف کو بس کا انتظار بہت طویل محسوس ہوا۔ آخر بس آئی اور بچے اس میں سوار ہو چکے تو توصیف نے بے تابی سے پوچھا "آپ آئیں گی نا مجھ سے ملنے؟"

"ہاں......ٹھیک ہے......آجاؤں گی......" اب وہ نظر چراتے

ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

''کہاں........؟'' وہ فرط جذبات سے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

''یہ بھی آپ ہی بتادیجئے۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں بولی۔

''توصیف نے ایک ریستوران کا نام بتایا جولب سڑک تھا۔نایاب نے وہ ریستوران دیکھا ہوا تھا جہاں وہ آسانی سے جاسکتی تھی۔''

ٹھیک ہے،میں آجاؤں گی لیکن مجھے صرف تین سے چار بجے تک کا وقت سوٹ کرتا ہے میں صرف اس دوران میں آسکتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے......میں تین بجے آپ کا وہاں انتظار کروں گا۔''

نایاب نے سرکوخفیف سے جنبش دی اور رخصت ہوگئی۔

توصیف دفتر پہنچا تو اس کیلئے وقت گزارنا مشکل ہوگیا۔اسے محسوس ہوا کہ جیسے وقت کی رفتار بہت سست ہوگئی ہے۔وہ بار بار چونک کر گھڑی کی طرف دیکھتا.........وقت گویا گزر ہی نہیں رہا تھا آج

نایاب نے ملنے کی حامی بھری تھی تو اس کے لئے انتظار کے لمحے کسی عذاب سے کم نہیں تھے وہ گویا ایک ایک لمحہ شمار کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ شاید وہ نہ آئے۔

اس نے دفتر میں بڑی مشکل سے وقت گزارا۔ آخر وہ ڈھائی بجے دفتر سے بھاگ کھڑا ہوا چند ضروری کام تھے جن پر اس نے بالکل توجہ نہ دی تھی۔ تین بجے سے کچھ پہلے ہی وہ ریستوران جا پہنچا۔ گاڑی کھڑی کر کے وہ فٹ پاتھ کی طرف سے گھوم کر ریستوران میں جانے ہی لگا تھا کہ اس نے سامنے سے ایک جانی پہچانی سی گاڑی آتے دیکھی۔ وہ ٹھٹھک گیا.......وہ نایاب کے شوہر سکندر علی کی گاڑی تھی اور اس میں وہی تھا۔ وہ اکیلا ہی معلوم ہوتا تھا اور سست رفتاری سے گاڑی چلاتا آ رہا تھا۔

توصیف کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا کہ ضرور نایاب نے اپنے شوہر کو سب کچھ بتا دیا ہے اور اسے یہاں بھیج دیا ہے۔ اب وہ توصیف سے نمٹنے آ رہا ہے۔ نایاب نے نہ جانے اس کے بارے میں شوہر کو کیا کیا بتایا تھا۔ جس کے نتیجے میں سکندر علی اسے سبق سکھانے وہاں آ پہنچا تھا۔

توصیف غیر ارادی سے انداز میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ اسے کسی غنڈہ گردی لڑائی جھگڑے کا خوف نہیں تھا وہ خود بھی کچھ ایسا نازک اندام نہیں تھا اور نہ ہی اس کا شمار بزدلوں میں کیا جا سکتا تھا اب سڑک تماشا بننے یا کسی بھی قسم کی رسوائی کی داستان گھر تک پہنچنے کا تصور بہر حال اسے خوفزدہ کرتا تھا۔

اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے مگر یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی اور پھر اس کی اعصاب تیزی سے معمول پر آتے چلے گئے کہ سکندر علی اس کی

طرف دیکھے بغیر اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرتکز رکھتے ہوئے گزرتا چلا گیا۔اس نے فٹ پاتھ یا ریستوران کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا جلد ہی اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ایک بار پھر توصیف کی نظریں اس طرف جم گئیں جس طرف سے ٹریفک آ رہا تھا۔

عین مقررہ وقت پر اسے نایاب اسی طرف سے ایک چھوٹی گاڑی میں آتے دکھائی دی۔گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔اس نے گاڑی ریستوران کی طرف موڑی اور جب وہ گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر کے آئی تو توصیف دروازے کے قریب اس کا منتظر تھا۔وہ ہمیشہ سے کچھ زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی لگتا تھا اس نے اس ملاقات کیلئے کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کیا تھا۔توصیف کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اسے صرف موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ آ جائے

.........ممکن ہے وعدہ کرنے کے باوجود نہ آپاتی۔

بہرحال وہ آگئی تھی۔اس خیال سے توصیف کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جارہی تھیں۔وہ کچھ ملکہ کی سی تمکنت،وقار اور ٹھہراؤ سے چلی آرہی تھی لیکن اس کا چہرہ اس کے اندرونی اضطراب کا آئینہ دار تھا۔وہ آتو گئی تھی لیکن اس کے اعصاب تو یقیناً اسی قسم کے تناؤ کے شکار تھے۔جس سے توصیف دوچار تھا۔توصیف غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے تھامتے رہ گیا۔

یہ تجربہ اس کیلئے انوکھا اور ناقابل یقین سا تھا کہ وہ اس کی ضد اور اس کی خاطر یہاں چلی آئی تھی۔لیکن کچھ بعید نہیں تھا وہ اسے یہاں ڈانٹ ڈپٹ کرنے یا سمجھانے آئی ہو.........بلکہ زیادہ امکان اسی کا تھا کوئی ایسی ملاقات نہیں تھی جس کے رومانوی یا دوستانہ ہونے کی توقع رکھی جاسکتی۔

قریب آکر اس نے گہری نظروں سے توصیف کا جائزہ لیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ توصیف مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا، "کچھ دیر پہلے سکندر صاحب یہاں سے گزرے تھے۔"

نایاب کی پرسکون آنکھوں میں خفیف سی ہلچل پیدا ہوئی اور وہ دھیمے لہجے میں بولی "ہاں........مجھے یاد نہیں رہا تھا.......وہ تو اکثر یہاں سے گزرتے ہیں۔ دن میں کئی بار ان کا ادھر چکر لگتا ہے۔"

"کیوں........؟" توصیف تھوک نگل کر بولا۔ اب اسے یہ خدشہ ستانے لگا تھا کہ کہیں اتفاق سے سکندر علی دوبارہ یہاں سے نہ گزریں یا اتفاق سے یا کسی کام سے ریستوران میں ہی نہ آجائے۔

"قریب ایک ہی بلڈنگ میں ان کا کام چل رہا ہے۔" نایاب نے بتایا "کنسٹرکشن آخری مراحل میں ہے۔"

''اوہ.........!''توصیف صرف اتنا ہی کہہ سکا وہ ابھی ریستوران میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

''ہو سکتا ہے وہ گزرتے ہوئے کسی بھی وقت کچھ دیر کے لئے اندر آبیٹھنے کا فیصلہ کرلیں اور اسی وقت ہم بھی اندر بیٹھے ہوئے ہوں ....'' نایاب نہایت آہستگی سے بولی۔ گویا جو خدشہ توصیف کے ذہن میں تھا وہ بھی اسی طرح سوچ رہی تھی۔

''پھر.........پھر کیا کیا جائے؟'' توصیف نے پوچھا۔

''بہتری یہی ہے کہ کہیں اور چلئے۔''

''کہاں؟'' بے اختیار توصیف کے منہ سے نکلا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ سوال نہایت احمقانہ تھا۔ یہ فیصلہ اسے خود کرنا چاہئے تھا۔

''کہیں بھی نایاب کی آواز اب سرگوشی میں ڈھل گئی۔ تب اچانک ہی

توصیف کو احساس ہوا کہ نایاب کی آواز میں خفگی جھنجھلاہٹ یا برہمی کی کوئی جھلک نہیں ہے۔ اس ناگواری اور ناپسندیدگی کا نشان تک نہیں تھا جس اظہار وہ ٹیلی فون پر کرتی تھی۔ اس وقت تو اس کا لہجہ ایک مفرور قیدی کا سا تھا جو اس کی پناہ میں آنا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے وہ تحفظ کی کچھ یقین دہانی چاہتا ہے۔

پھر توصیف نے خود کو سمجھایا شاید یہ لہجہ صرف اس وقت تک کے لئے ہے جب تک وہ کسی محفوظ جگہ نہ جا بیٹھتے۔ اس کے بعد شاید وہ اپنے آپ کو سنبھالتی اور اس ڈانٹنا اور سمجھانا شروع کر دیتی۔ آگے چل کر خواہ کچھ بھی ہوتا لیکن اس وقت اس کے دھیمے پن سے شہ پا کر توصیف یکدم ہی گویا ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ایک عجیب سے فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔

''میرے ساتھ آیئے.........اپنی گاڑی یہیں رہنے دیجئے......

..........بعد میں لے لیجئے گا۔"

اس نے صرف ایک لمحہ سوچا اور توصیف کے ساتھ چل دی۔ راستے میں توصیف بولا "کسی بھی ریستوران میں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔ ہر جگہ لوگوں سے سامنا ہوگا۔ کہیں بھی کوئی جاننے والا دکھائی دے سکتا ہے ہمیں تنہائی میں.......تخلیے میں بیٹھ کر بات کرنی چاہئے۔ یہاں کوئی ہمیں نہ دیکھے اور ہم سکون سے بیٹھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔"

نایاب کچھ نہ بولی وہ ایک ٹک سڑک کو تک رہی تھی۔ اس نے توصیف کی بات سے نہ تو اتفاق کی اور نہ ہی اختلاف۔ وہ کچھ عجیب پراسرار سے انداز میں خاموش تھی۔ اس کا ذہن جیسے کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔

چند منٹ بعد توصیف نے گاڑی ایک فائیو سٹار ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں لے جا کر روکی۔ بریف کیس اٹھائے وہ گاڑی سے اترا اور نایاب کو

ساتھ لے کر ہوٹل میں داخل ہوا اور ریستوران اور کافی بار کی طرف جانے کی بجائے وہ ایک ریسپشن پر جا رکا "ایک ڈبل بیڈ روم۔" اس نے مسکراتے ہوئے فرمائش کی۔ کلرک نے جواباً پیشہ ورانہ خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے اس کے سامنے ایک کارڈ رکھ دیا۔ توصیف نے چند سیکنڈ میں اسے پر کر دیا۔ اس کے اندراجات کے مطابق وہ مسٹر اور مسز توصیف تھے اور بزنس ٹرپ پر حیدر آباد سے کراچی آئے تھے۔

"اینی لگیج سر؟" کلرک نے کارڈ پر نظر ڈالتے کے بعد ان کے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نو......" توصیف نے اعتماد سے جواب دیا "ہمیں کراچی میں بہت تھوڑی دیر کا کام ہے اگر ہو گیا تو شاید آج ہی حیدر آباد چلے جائیں گے۔ ہم تو صرف سفر کی تھکن کی وجہ سے کچھ دیر یہاں ٹھہریں گے۔"

کلرک نے بے نیازی سے سر ہلایا۔ چونکہ ان کے ساتھ کوئی سامان

نہیں تھا اس لئے کلرک نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے کاؤنٹر کے قریب ہی واقع آفس سے کمپیوٹر پر تیار شدہ ان کی ایڈوانس ادائیگی کا بل جس میں کچھ سکیورٹی کی رقم بھی شامل تھی۔ اس کے سامنے رکھا۔ توصیف نے نقد ادائیگی کی اور کلرک نے چابی اس کے حوالے کر دی۔ ایک بیل بوائے اس کا بریف کیس اٹھا کر اس کے آگے آگے چل پڑا۔ نمبر سے اندازہ تھا کہ ان کو دیا جانے والا کمرہ ساتویں منزل پر تھا۔

اس تمام کاروائی کے دوران نایاب خاموشی سے فرش کو گھورتی رہی۔ توصیف کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کسی بھی لمحے سر اٹھا کر وہ کہہ دے گی کہ وہ تو کمرے میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اور وہ پھر کلرک کو بھی بتا دے گی کہ وہ اس مرد کے ساتھ ضرور آئی تھی۔ لیکن اس کی بیوی نہیں تھی۔........ مگر ایسا نہیں ہوا۔ تاہم توصیف

کیساتھ چلتے ہوئے وہ بار بار پھیلی پھیلی آنکھوں سے اس کیطرف دیکھتی جارہی تھی۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن آگے چلتے ہوئے بیل بوائے کی وجہ سے خاموش ہو۔

بیل بوائے لفٹ کے ذریعے انہیں ساتویں منزل پر واقع ایک کمرے میں پہنچا کر جا چکا تو توصیف دھم سے ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اسنے دیکھا کہ نایاب بدستور کھڑی تھی۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بیٹھ جایئے نا.........پلیز......!'' توصیف نے دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے آپ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔'' وہ بیٹھے بغیر بولی۔ اسکے لہجے میں غصہ نہیں شکوہ تھا۔

''بہر حال......اب.......تو ہو چکی ہے..........اب.......بیٹھ

''باتیں؟'' اس نے اطمینان سے دہرایا'' باتیں تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں نے تو آپ سے فون پر ہی کہہ دیا تھا میں بس جی بھر کہ آپ کو دیکھنا چاہتا تھا'' اور وہ واقع ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

نایاب خاموش تھی اور قدرے حیرت سے پلکیں جھپکانے لگی۔ وہ یقیناً پرسکون اور مضبوط اعصاب کی مالک تھی لیکن توصیف کے اس طرح دیکھنے کی وجہ سے کسمسانے لگی اور پہلو بدلنے لگی۔

''آخر وہ گہری سانس لے کر بولی'' آپ کے دماغ میں واقع کچھ خلل ہے۔''

''آپ کو دیکھنے کے بعد آگیا ہے پہلے تو میرا دماغ بالکل ٹھیک تھا۔'' توصیف مسکراتے ہوئے بولا پھر وہ اٹھ کر اس کے قدموں میں آبیٹھا اور اسطرح اس کیطرف دیکھتا رہا۔ نایاب کا چہرہ پہلے چاندنی جیسا تھا۔ اب اس پر شفق لہرانے لگی۔

آخر وہ سر جھکاتے ہوئے دھیمی آواز میں خود کلامی کے سے انداز میں بولی ''مجھے خود پر یقین نہیں آرہا........آخر میں اس طرح آپ کے ساتھ کیوں چلی آئی..........میں نے ایسا کیوں کیا............؟''

یہ میری محبت کی طاقت ہے جو آپ کو کھینچ لائی ہے۔''توصیف وثوق سے بولا۔

''محبت.....!اور اس عمر میں.......؟دو دو بچوں کے والدین ہوتے ہوئے ہم ایسی باتیں کرتے عجیب نہیں لگتے ؟''اسکا لہجہ بدستور دھیما تھا۔

''میرے خیال میں تو محبت کی باتیں کرنا کسی عمر میں بھی عجیب نہیں لگنا چاہئے۔''توصیف بولا۔اب وہ پرسکون ہوتا جارہا تھا۔اسکی خود اعتمادی لوٹ رہی تھی یہ احساس اس کے لئے بڑا اطمینان بخش تھا کہ اب وہ اس پر برہم نہیں تھی۔

ایک گہری سانس لے کر نایاب نے بیڈ کے پشتے سے ٹیک لگا لی اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔اس کی آنکھیں جیسے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو تک رہی تھیں ......اور پھر توصیف حیران رہ گیا۔

دو آنسو موتیوں کی طرح نایاب کے رخساروں پر پھیل آئے تھے۔

توصیف نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔توصیف آنسوؤں کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن الفاظ اس کے ذہن میں گویا گڈمڈ سے ہو گئے تھے۔اور زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔اس کے آنسو دیکھ کر توصیف کا دل کٹا جا رہا تھا۔

اسکے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ آنسوؤں سے بھیگی سرگوشی میں بولی"

آپ بہت ظالم ہیں۔"

"میں....؟" توصیف حیرت سے بولا۔

''ہاں' آپ نے میرے خوابیدہ زخموں کو بری طرح سے کھرچ ڈالا ہے اب وہ پھر اذیت دینے لگے ہیں ان سے محرومیوں کا لہو رسنے لگا ہے'' وہ اتنی دھیمی آواز میں بول رہی تھی کہ توصیف بمشکل سن رہا تھا وہ نایاب کے کچھ اور نزدیک ہو گیا۔

''میں........میں جب سترہ اٹھارہ سال کی تھی تب کسی نے اتنی شدت اتنی دیوانگی سے مجھے چاہا تھا۔'' اسکے لہجے میں درد گویا کروٹیں لے رہا تھا۔

''کیا آپ بھی اسے چاہتی تھیں؟'' توصیف نے بے تابی سے پوچھا

''ہاں....'' نایاب نے جواب دیا اور تکلیف کے سے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔'' ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے وہ بلا کا ذہین تھا تعلیم کے حوالے سے وہ پوری کلاس سے آگے تھا۔ ٹیچرز بھی اس کی قدر کرتے تھے۔ وہ کالج کی تفریحی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ

لیتا تھا کالج کوکوئی فنکشن اس کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ کالج میگزین میں اس کے افسانے چھپتے تھے۔شکل وصورت اور جسمانی لحاظ سے وہ وجیہہ تھا تو کردار کی پختگی میں بھی مثالی نوجوان تھا لیکن........''

''لیکن کیا........بتائیے نا...........''

''وہ غریب تھا......ایک پولیس انسپکٹر کا بیٹا تھا وہ........مگر کئی خوبیوں کے علاوہ اس کے سینے میں محبت کا ایک سمندر موجزن تھا۔''

''پولیس انسپکٹر کا بیٹا اور غریب؟''توصیف نے حیرت سے کہا۔اس نے کوشش کی کہ اس کے لہجے سے استہزائیہ جھلکنے پائے۔

''ہاں اس کا باپ عام روایتی پولیس افسروں سے بہت مختلف تھا۔'' نایاب اپنی دھن میں بولتی چلی گئی۔''اس کے باپ نے کبھی رشوت نہیں لی تھی۔اس کے باپ کا کردار بھی مثالی تھا۔وہ اپنی اولاد کو حرام کا

ایک لقمہ بھی کھلانے کا قائل نہ تھا......ویسے بھی پولیس افسروں کی اولادیں جن کی پرورش حرام کی دولت پر ہوئی ہو جن کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں اکثر سہل پسند کند ذہن اور غبی ہوتے ہیں۔فہد ایسا نہیں تھا.........وہ والدین کیساتھ جہانگیر روڈ کے ڈی ٹائپ کوارٹر میں رہتا تھا......بولتے بولتے اچانک وہ خاموش ہوگئی۔

توصیف چند لمحے منتظر سے انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا اور جب وہ مزید کچھ نہ بولی تو وہ گویا اپنے حلق میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگلتے ہوئے بولا''کیا یہ محبت کی وہی پرانی کہانی ہے جو بار بار دہرائی جاتی رہی ہے۔ہر جگہ......ہر مقام پر.........ہر ملک میں.......ہر دور میں غریب لڑکا اپنی غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا گیا۔ماں باپ نے لڑکی کی شادی خوشحال گھرانے میں طے کر دی اور لڑکی نے ماں باپ کی ضد کے آگے مجبور ہو کر.......یا ان کی عزت کی خاطر ان کے فیصلے پر

سر جھکا دیا؟''

نایاب کا سر دھیرے سے نفی میں ہلا''اس کی تو نوبت ہی نہ آسکی.......

........وہ اپنے باپ کی فرض شناسی اور ایمانداری کی بھینٹ چڑھ گیا..........''

''کیا مطلب؟''اس کی بات سن کر توصیف کو جھٹکا سا لگا۔

مطلب یہ کہ فہد کے والد نے ایک آوارہ اور بدچلن نوجوان کو گرفتار کیا جس نے ایک لڑکی کو اغوا کر کے.........اس کی عزت لوٹی اور پھر اسے قتل کر دیا لڑکے کا باپ جو کہ اندرون سندھ کا وڈیرا تھا۔سیاست میں بھی اسکا خاصا عمل دخل تھا وہ اپنے سپوت کو چھڑانے فوراً تھانے پہنچا۔فہد کے والد کو دھمکیاں دیں لیکن وہ اس کی دھمکیوں میں نہ آئے اور نہ ہی رشوت قبول کی۔اگلے دن انہوں نے اغوا اور قتل کا مقدمہ بنا کر لڑکے کو کورٹ میں پیش کر دیا غیر متوقع طور پر مقدمہ طول پکڑ گیا۔

اور لڑکے کو سزا ہوگئی..........اس سلسلے میں پریس نے بھی خاصا کردار ادا کیا جس دن عدالت نے فیصلہ سنایا اسکے ٹھیک ایک ہفتے بعد فہد کو کالج سے واپس گھر جاتے ہوئے ''نامعلوم افراد'' نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔وہ عجیب سے کیفیت میں بولتی چلی گئی۔اس کی بند آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

''اوہ..........!''توصیف نے متاسفانہ انداز میں سر جھکا لیا۔نایاب کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھا۔نایاب نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا توصیف نے محسوس کیا کہ وہ اسکے قطعی مختلف عورت تھی۔جسے وہ اب تک دیکھتا آرہا تھا وہ اسے اور بھی اچھی لگی وہ اٹھ کر اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔اسنے کوئی اعتراض نہ کیا تاہم وہ گاؤ تکئے اور بیڈ کے سرہانے والے تختے کا سہارا چھوڑ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اس کا سر گویا کسی انجانے بوجھ سے

جھکا ہوا تھا۔

''مگر اب.........جب کہ یہ زخم مندمل ہو چکے تھے میں اس دکھ کو تقریباً بھول چکی تھی..........تو آپ میری زندگی میں ہلچل مچانے چلے آئے۔ مجھے آپ کا والہانہ پن دیکھ کر خوف آتا ہے تب ہی تو میں آپ سے دور رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''یہ آپ کا اپنی ذات کے ساتھ ایک اور ظلم تھا۔'' توصیف بولا۔

''کوئی غیبی طاقت میرے کان میں سرگوشیاں کرتی تھی کہ اگر میں ایک بار بھی آپ کے قریب ہوئی تو کچھ ہو جائے گا......میری کوئی محرومی !ابھر کر سامنے آجائے گی اپنی ذات پر میرا اختیار اٹھ جائے گا۔ وہ دھیمی اور لرزاں آواز میں کہہ رہی تھی۔

توصیف نے اپنے اندر ایک عجیب سی جرات کا ابال محسوس کرتے ہوئے اس کی آنسوؤں کی لکیریں اس کے پھول رخساروں سے پونچھ

دیں۔ اور اسے اپنے قریب کرلیا۔ نایاب نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ یکا یک توصیف کو کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس عورت سے اس کا ایک دیرینہ تعلق تھا اس کے درمیان ایک لمبی رفاقت چلی آرہی تھی حجاب کی کوئی دیوار اور اجنبیت کی کوئی خلیج اور خوف کا کوئی عنصر بیچ میں حائل نہیں تھا۔

شاید نایاب کی بھی یہی کیفیت تھی فائیو سٹار ہوٹل کے کمرے کی حسین تنہائی میسر آئی تو گویا اجتناب کی ساری دیواریں ایک ایک کر کے ڈھے گئیں.........دونوں کے انداز میں کئی دنوں کے پیاسوں کی سی بے تابی تھی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ایک دوسرے پر چھاتے چلے گئے۔

نایاب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے اندیشے درست ہی تھے کہ کچھ ہو جائے گا اس کی کوئی محرومی سامنے آجائے گی۔ کچھ توصیف کے ساتھ

بھی ہوا اور وہ خواہشوں کے افق پر ایک اونچی اور طویل پرواز کے بعد دھیرے دھیرے زمین پر واپس آئے تو نایاب کی روح گویا پچھتاؤں پر مضمحل تھی۔

''وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی'' میں نے ایسا ہرگز نہیں چاہا تھا........بخدا میں کوئی بدچلن عورت نہیں ہوں۔'' وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔

''اگر یہ صفائیاں آپ میرے سامنے پیش کر رہی ہیں تو مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میری نظر میں آپ کا مقام ہمالیہ سے اونچا ہے۔ اب بھی اونچا ہے.......اور ہمیشہ اونچا ہی رہے گا۔'' توصیف محبت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے بولا۔

''یہ میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ نایاب اس سے نظر ملائے بغیر بولی۔'' درحقیقت میں اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ آپ تو کہے

جا رہے تھے کہ آپ کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے.......اب مجھے اپنے آپ سے سوال کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' وہ یقیناً بہت پریشان تھی۔

''اپنے آپ کو بیکار سوالوں میں الجھا کر پریشان نہ کریں۔'' توصیف نے اس طرح گویا اپنا اور اس کا احساس جرم کم کرنے کی کوشش کی ''جو ہونا تھا ہو گیا.........اور جو ہونا ہے وہ بھی ہو کر رہے گا۔ شاید یہ محبت کی تشنگی ہے جو اپنے ساتھ خواہشوں کا طوفان بھی لے آئی۔''

''میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ میری زندگی میں کوئی تشنگی، کوئی کمی، کوئی نا آسودگی ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں مجھے اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں اور میں ہمیشہ اس کی وفادار ہی رہنا چاہتی تھی۔'' اس کے لہجے میں اب بھی ایک پچھتاوا ایک پیشمانی بول رہی تھی۔

''ہمارے دل اور ذہن کے نہاں خانوں میں کہاں کوئی محرومی

......کہاں کوئی تشنگی، اور کہاں کوئی پاگل تمنا چھپی ہوئی ہے۔.....یہ ہم خود بھی صحیح طور نہیں جانتے۔انسانی ذہن کی بھول بھلیوں کے سارے بھید تو انسان خود بھی نہیں جانتا۔'' وہ اپنی تمام تر ذہانت اور حاضر جوابی کے ساتھ جس حد تک بھی ممکن ہو سکا اسے سمجھاتا رہا۔رفتہ رفتہ جیسے نایاب کو قرار سا آنے لگا۔ پچھتاوے اور پشیمانی کا احساس معدوم ہونے لگا۔

خاصا وقت گزر چکا تو وہ پہلے ہی کی طرح پرسکون دکھائی دینے لگی۔ بلکہ جب وہ دھیرے دھیرے باتوں میں کھلنے لگی تو توصیف کو اندازہ ہوا کہ وہ تو کافی شگفتہ مزاج بھی تھی لیکن یہ شگفتگی برف تلے دبی چنگاریوں کی طرح تھی۔کبھی کبھی کوئی چنگاری اپنی جھلک دکھا جاتی تھی یوں ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

اب صرف توصیف ہی اسے فون نہیں کرتا تھا۔وہ بھی موقعے کی

مناسبت سے کبھی موبائل فون پر اور کبھی دفتر فون کر لیتی تھی۔ گھر پر اس نے توصیف کو کبھی فون نہیں کیا۔ اس کے لئے توصیف کو اسے کوئی ہدایت کرنا نہیں پڑی تھی۔ وہ خود ہی احتیاط اور سمجھداری کو ثبوت دے رہی تھی۔ توصیف بھی اسے فون کرنے کے معاملے میں ہر طرح سے احتیاط برتتا۔ اگر اس کی ملازمہ.........اور قطع غیر متوقع طور پر اس کا شوہر فون اٹھالیتا تو وہ ''رانگ نمبر'' کا ڈرامہ کر کے فون بند کر دیتا۔ اگر کبھی نایاب ہی اٹھاتی لیکن اس کی آواز پہنچاننے کے باوجود ''رانگ نمبر'' کہہ دیتی تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کا شوہر گھر پر موجود ہے یا کسی اور وجہ سے بات کرنے کے لئے وقت مناسب نہیں ہے۔

ہفتے دس دن میں کسی فائیو سٹار یا فورسٹار ہوٹل میں ملاقات کا پروگرام طے پا جاتا۔ سارا مسئلہ ہی گویا پہلی ملاقات کا تھا۔ اس کے بعد تو گویا صدیوں کی شناسائی نکل آئی۔ اس پچھتاوے، ندامت یا احساس جرم

کا کہیں نشان نہ رہا تھا۔ جو پہلی ملاقات پر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب دونوں نے خود کو گویا حالات اور جذبات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

دونوں کو ہی کچھ یوں لگتا جیسے نوجوانی کا دور لوٹ آیا تھا بلکہ معاملہ نوجوانی سے بھی کچھ بڑھ کر تھا کیونکہ نوجوانی میں بھی چوری چھپے کی ایسی ملاقاتوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا جیسی ان کے درمیان اب چل رہی تھیں۔ ان کی زندگیوں میں ایک عجیب سی سنسنی ہیجان خیزی اور جوش و خروش در آیا تھا ایک نئی زندگی تھی جو اس کی اصل زندگی کے متوازی گزارنے لگے تھے اور یہ اصل زندگی سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیجان خیز اور خوشی دینے والی ہوتی تھی۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں نایاب اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”توصیف ! آخر یہ کیا ہے؟ ہمیں سوچنا پڑے گا ہم اپنے تعلق کو ان ملاقاتوں کو آخر کیا نام دے سکتے ہیں؟“

''یہ محبت ہے۔'' توصیف نے اطمینان سے جواب دیا۔

''محبت......؟''

''ہاں، صرف اور صرف محبت............!''

''لیکن محبت میں خواہشوں کی حکمرانی کہاں سے آ گئی؟''

''محبت خواہشوں کی آمیزش کے بغیر تو نہیں ہوتی۔ تم نے دیکھا نہیں ہر محبت کرنے والا جوڑا آخر شادی ہی کیوں کرنا چاہتا ہے؟ شادی کو ہی محبت کی معراج کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور شادی نہیں ہوتی تو دونوں محبت کرنے والوں کی زندگیاں آہیں بھرتے کیوں گزرتی ہیں اور یہ کیوں سمجھا جاتا ہے کہ محبت ناکام ہوگئی ہے؟''

نایاب کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے کچھ سوال ضرور سر ابھار رہے تھے جو روپ بدل بدل کر سامنے آ رہے تھے۔

''لیکن ایسا کب تک چلے گا؟'' وہ اپنی ساڑھی کا آنچل اپنے انگلیوں پر لپیٹتے اور کھولتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے سے فکرمندی عیاں تھی۔

''ڈرنا چھوڑو۔'' نایاب جتنی فکرمند تھی توصیف اتنا ہی خوش دکھائی دے رہا تھا۔

''ہاں.........تم یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہو کیونکہ تم ایک مرد ہو تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی ایک تلخی تھی۔

''تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟'' توصیف اندر ہی اندر خفیف سی بدمزگی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''ظاہر ہے، ذلت اور رسوائی کا.......گھر اجڑنے کا۔'' اس نے یوں توصیف کی طرف دیکھا جیسے اسے ایسے احمقانہ سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی'' کبھی کبھی میں رات کو لیٹے

ہوئے ڈری سی جاتی ہوں۔شاید مجھے اس دلدل کے قریب نہیں پھٹکنا چاہئے تھا۔جس میں پاؤں پڑتے ہی دن بہ دن گہری سے گہری دھنستی جارہی ہوں۔ایسی دلدلوں کی گہرائیاں بہت تیزی سے انسان کواپنی طرف کھینچتی ہیں۔"بات ختم کرکے نایاب نے جھرجھری سی لی۔

"تم خوامخواہ کے اندیشوں سے ہول مت کھایا کرو۔ہماری ملاقاتیں راز داری سے جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔"توصیف نے اسے یقین دلایا لیکن خود اسکے اپنے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

"کوئی چوری ہمیشہ راز نہیں رہتی۔کبھی نہ کبھی راز کھلتا ہی ہے۔" نایاب بولی۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ ہم یوں ملنا چھوڑ دیں؟" آخر توصیف نے براہ راست ایک اہم سوال کرڈالا۔

"نہیں.........شاید میں یہ بھی نہیں چاہتی۔" اس نے بے بسی سے اعتراف کیا۔ "میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں تمہارے بغیر رہ بھی نہیں سکتی لیکن یہ بھی چاہتی ہوں کہ ہمیں یوں چوری چھپے نہ ملنا پڑے ....جو زندگی میں اپنے شوہر کیساتھ گزار رہی ہوں وہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا "لیکن فی الحال یہ مجھے بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن سا دکھائی دیتا ہے۔ ہم دونوں کا ازدواجی بندھن.........بچوں کی محبت.........اپنی نیک نامی کا خیال ....یہ سب کچھ ہمارے جسموں ہماری روحوں کا ایک حصہ ہے ہمارے خون میں شامل ہے ان سب چیزوں کو ہم خود سے جدا نہیں کرسکتے.........اپنے وجود سے نہیں نکال سکتے لیکن بہرحال ہم اس پر سوچیں گے، کوئی راستہ تلاش کریں گے ابھی کچھ وقت گزرنے

دو۔ کبھی کبھی وقت خود بہت سے سوالوں کے جواب اپنے ساتھ لے آتا ہے۔''

حقیقت یہی تھی کہ توصیف کا خود اپنے گھر سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ بیوی کے ساتھ اس کے رویے میں اچھی خاصی بے توجہی آگئی تھی۔ جسے اس نے محسوس بھی کرلیا تھا تاہم وہ بڑی تحمل مزاج اور بڑی بردبار عورت تھی کوئی سوال زبان پر نہیں لاتی تھی لیکن کبھی کبھی توصیف محسوس کرتا جیسے وہ پرخیال انداز میں خاموشی سے اس کی طرف تک رہی ہے توصیف اچانک سر اٹھا کر دیکھتا تو وہ کسی اور طرف دیکھنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں ایک مبہم سونا پن رچنے لگا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ توصیف کو اس کے ساتھ باقی زندگی گزارنے کی کچھ ایسی تمنا نہیں رہی تھی لیکن بچوں کا سوال بہت اہم تھا۔ بچوں سے اسے بہت محبت تھی۔ اس سے لاتعلق ہونا' یا اس تعلق کو کمزور کرنا وہ ہرگز نہیں چاہتا

بگڑے خواب

خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی اپنی
محبت کو انہی خوابوں میں ڈھونڈنا شروع کر
دیا، لیکن قدرت کا کھیل کہ اسے وہ سب
کچھ نہ ملا جو وہ چاہتی تھی محبت ہی محبت۔

تھا۔

پھر سوال یہ بھی تھا کہ نایاب اپنے شوہر سے طلاق کیسے لے گی؟ کسی جواز کے بغیر کسی معقول وجہ کے بغیر اور پھر اس کے شوہر کا ردعمل کیا ہوگا؟ وہ کسی رسوا کن فیصلے پر آسانی سے سر جھکا دینے والا۔ ایثار کرنے والا یا رد کئے جانے کو خاموشی سے قبول کر لینے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا.........اور اس کی تصدیق نایاب کی باتوں سے بھی ہوتی تھی۔

چنانچہ یہ سوال بہت سنگین تھے۔ ابھی توصیف ان میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں نایاب سے اس کے تعلق کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ ابھی انہیں ایک دوسرے کو اور بھی اچھے طریقے سے جاننا اور سمجھنا تھا ابھی ایک دوسرے کی ذات کے نہ جانے کون کون سے پہلو نظروں سے اوجھل تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ صدیوں سے ایک دوسرے

کے شناسا محسوس کرتے تھے لیکن شاید یہ ایک افسانوی سا احساس تھا۔ پہلے سے قائم شدہ بہت سے مضبوط بندھن جو ناخنوں کی طرح گوشت میں پیوست تھے۔انہیں توڑ کر یکجا ہونا اور باقی پہاڑی زندگی ساتھ گزارنا ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔اسکا تعلق حقائق کی دنیا سے تھا۔ توصیف میں کم از کم اتنی سمجھ ضرور باقی تھی کہ وہ اپنے مجنونانہ عشق کے باوجود جلد بازی میں یا افراتفری میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید وہ نایاب کی چھٹی حس تھی جو اسے روز اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا کر رکھتی تھی۔شاید کوئی غیبی طاقت پیشگی خبردار کر رہی تھی۔

اس روز وہ ہوٹل سے رخصت ہو رہے تھے اور ہوٹل کی لابی کے وسط میں تھے کہ سامنے سے جمیل احمد آتے دکھائی دیئے۔جمیل احمد چالیس کی عمر کے ایک بھاری بھرکم اور کم رو شخص تھے۔وہ نایاب والی گلی میں رہتے تھے۔وہ یقیناً نایاب کو بھی پہچانتے تھے۔لیکن اتفاق سے

توصیف کی ان سے اچھی شناسائی تھی کیونکہ وہ پہلے توصیف کے قریب ہی ایک منزل پر کرائے پر رہتے تھے۔ پھر زیادہ خوشحالی آئی تو اس نے نایاب کی گلی میں بکنے والا ایک بنگلا خرید لیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔

اب گو کہ توصیف سے ان کا سامنا کم ہی ہوتا تھا لیکن جب بھی ملتے تھے تو خاصی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے تھے کم پڑھے لکھے اور ذرا کم تمیز دار آدمی تھے۔ اس کی وجہ بھی کافی حد تک توصیف کی سمجھ میں آتی تھی۔ وہ اتفاق سے ان کے خاندانی پس منظر سے بھی واقف ہو چکا تھا وہ کیا ان دونوں گلیوں میں رہنے والے کئی افراد واقف تھے۔ لیکن بہرحال یہ کوئی طعنہ نہیں تھا اس علاقے میں ویسے بھی اس قسم کی باتوں کو زیر بحث نہیں لایا جاتا تھا جو ایک اچھی بات تھی۔

اب بہرحال وہ ایک معزز کاروباری آدمی تھے ان کا کچھ سپلائی وغیرہ کا

کام تھا اور بہت اچھا چل رہا تھا دوسروں کے طرح توصیف بھی ان سے رسمی طور پر اخلاق سے ملتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی وہ انہیں ذرا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسکی وجہ اس کا خاندانی پس منظر نہیں تھا۔ توصیف ایک پڑھا لکھا اور کشادہ ذہن کا آدمی تھا وہ اس قسم کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔

اصل بات یہ تھی وہ جمیل صاحب سے مل کر کچھ اچھا محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان کی شخصیت میں کچھ کمینہ پن تھا جو توصیف کو ویسے بھی محسوس ہوتا تھا اور ان کی باتوں سے بھی جھلکتا تھا۔ وہ خود گویا اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ لوگ ان کے خاندانی پس منظر سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔ وہ خوش فہمیوں کی نہ جانے کن بلندیوں پر رہتے ہوئے اپنے سے کہیں بہتر لوگوں کا مذاق اڑاتے، عیب جوئی میں مبتلا رہتے۔ ہمیشہ دوسروں کے عیب تلاش کرنے میں کوشاں رہتے۔ ان کی گفتگو

سے بڑبولے پن کا اظہار بھی ہوتا۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں حقارت سے گفتگو کرتے۔

مجموعی طور پر وہ توصیف کو ایسی شخصیت بالکل نہ دکھائی دیتے جن سے میل جول رکھا جاتا۔ لیکن بہرحال سابق پڑوسی تھے اور اب بھی ہمسایوں میں ہی شمار ہوتے تھے جب وہ باچھیں کھلا کر ملتے تھے۔ تو توصیف کو بھی کم از کم مسکرانا تو پڑتا تھا۔

انہیں سامنے سے آتے دیکھ کر ایک لمحے کیلئے توصیف بھی چکرا سا گیا۔ اگر سامنا بھی ہونا تھا تو اس قسم کی شخصیت سے! انہوں نے توصیف اور نایاب کو شانہ بشانہ آتے بھی دیکھ لیا تھا۔ اب الگ ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ عام حالات میں وہ اکیلے توصیف کو دیکھ کر باچھیں کھلا کر ملتے تھے لیکن آج اسے نایاب کے ساتھ دیکھ کر ان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ویسے ہی ان کی آنکھیں کینہ توز دکھائی دیتی

تھیں۔اب تو توصیف کو وہ سانپ کی آنکھوں کے مشابہ دکھائی دیں۔ آج توصیف ان سے کچھ باچھیں کھلا کر ملا لیکن وہ شک کی نظروں سے دونوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔

توصیف جلدی سے بولا ”میں یہاں ایک کاروباری ملاقات کے سلسلے میں آیا ہوا تھا.........واپس آ کر دیکھا تو مسز سکندر علی بھی آڈیٹوریم میں لیڈیز کلب کی میٹنگ کے لئے آئی ہوئی تھیں اور واپس جا رہی تھیں۔انہوں نے بتایا کہ ان کی گاڑی کچھ پریشان کر رہی ہے میں نے کہا کہ مجھے گاڑیوں کا کچھ زیادہ پتہ نہیں لیکن چھوٹے موٹے مسائل سے نمٹ لیتا ہوں۔اس لئے چل کر دیکھ لیتا ہوں“ وہ کھو کھلے سے انداز میں ہنسا ”بھئی پڑوسیوں کے کام آنے کی اپنی سی کوشش کرنی چاہئے۔“

یہ جھوٹ توصیف نے فوری طور پر گھڑا تھا۔الفاظ خود بخود اس کے منہ

سے نکلتے چلے گئے۔ نایاب کے ساتھ نظر آنے کا اس سے بہتر بہانہ فوری طور پر اسے نہیں سوجھا تھا۔

''ضرور.....ضرور۔'' جمیل صاحب چبھتے ہوئے لہجے میں بولے ''لیکن توصیف صاحب! ہم آپ کے زیادہ قریبی پڑوسی رہے ہیں کبھی ہمارے کام بھی آجایا کریں۔''

''ضرور...ضرور۔'' کیوں نہیں جمیل صاحب! آپ کبھی حکم تو دیں۔'' توصیف اپنے اندر سے ابھرنے والے غصے کی لہر کو خوش خلقی کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ آج معاملہ کچھ الٹا ہی تھا۔ آج توصیف خوش خلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور جمیل سنجیدہ ہوئے جا رہے تھے۔

''اگر معاملہ گاڑی کا ہے تو چلئے ہم دیکھ لیتے ہیں۔'' جمیل آنکھیں سکیڑ کر نایاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ہمارا آپ کے کام آنیکا زیادہ

فرض بنتا ہے۔اب ہم آپ کے زیادہ قریبی پڑوسی ہیں۔اور گاڑیوں کے بارے میں بھی ہم توصیف سے زیادہ جانتے ہیں۔''

نایاب' جس کی رنگت جمیل کو دیکھ کر چند لمحے کیلئے زرد پڑ گئی تھی اب سنبھل چکی تھی۔وہ حتی الامکان وقار اور متانت سے بولی'' اتنی زحمت کی ضرورت نہیں.......گاڑی چل تو رہی ہے' بس ذرا جھٹکے لے رہی ہے۔میں نے تو یونہی برسبیل تذکرہ توصیف صاحب سے ذکر کر دیا تھا ورنہ میرا ارادہ انہیں بھی زحمت دینے کا نہیں تھا۔''

پھر وہ توصیف کی طرف دیکھ کر ذرا رکھائی سے بولی'' میرا خیال ہے توصیف صاحب......آپ بھی زحمت نہ کریں۔آپ جمیل صاحب کے ساتھ گپ شپ کریں میں چلتی ہوں۔''اور وہ جواب کا انتظار کیئے بغیر کھٹ کھٹ کرتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

توصیف دل ہی دل میں اس کی حاضر دماغی کا داد دیئے بغیر نہ رہ

سکا۔ اس نے یہ بہت ہی اچھا کیا تھا اس کے دیگر پہلو تو اپنی جگہ تھے۔
لیکن ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ جمیل کو........کم از کم چند لمحے
توصیف کے ساتھ نتھی کر گئی تھی۔ اور اسکے ساتھ رہنے پر مجبور کر گئی
تھی۔ جمیل اب نہ تو اس کے پیچھے جا سکتا تھا اور نہ اس کے ساتھ کمبل
ہو سکتا تھا۔ ورنہ وہ دیکھ لیتا کہ نایاب کی گاڑی ہوٹل کے کسی حصے میں
موجود ہی نہیں تھی۔ اسکی گاڑی کہیں اور کھڑی تھی۔ وہاں سے وہ
توصیف کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر ہوٹل آئی تھی۔

جمیل گردن موڑ کر بھی اسے جاتے دیکھتے رہے حتی کہ وہ دروازہ کھول
کر باہر غائب ہو گئی۔ توصیف اسے اتنی مہلت دینا چاہتا تھا کہ وہ جلد
از جلد کوئی رکشہ یا ٹیکسی پکڑ کر وہاں سے چلی جائے۔ وہ بظاہر اخلاقا
لیکن در حقیقت احتیاطا جمیل کا بھاری بھر کم ہاتھ پکڑے کھڑا تھا کہ
کہیں وہ نایاب کے پیچھے ہی نہ چل دیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں تھا وہ

ایسا کر بھی سکتے تھے۔

آخر کار بمشکل ان کی گردن واپس توصیف کی طرف گھومی اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے "واہ صاحب......... کیا غضب کی خاتون ہے۔ جدھر سے گزرتی ہے اپنے وجود کی خوشبوؤں کے جھونکے بکھیر جاتی ہے اور اس کے حسن کے اثر سے دیر تک دلوں میں گدگدی سی ہوتی رہتی ہے۔"

"بھئی واہ جمیل صاحب! آپ تو اچھی خاصی شاعرانہ سی گفتگو کر لیتے ہیں ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ اتنے باذوق ہیں۔" توصیف دل پر صبر کی سل رکھ کر بظاہر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے جناب.........! ہمارے بارے میں ابھی آپ کو معلوم ہی کیا ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"بھئی دیکھیں، کسی حسین خاتون کو دیکھ کر اور اس کا تذکرہ کر کے

ٹھنڈی آہیں نہ بھریں۔ آپ بال بچے دار آدمی ہیں۔'' توصیف بظاہر خوش مزاجی سے بولا۔

''بال بچے دار تو آپ بھی ہیں توصیف صاحب۔'' جمیل ترکی بہ ترکی بولے۔

''لیکن میں اس خاتون کے جانے کے بعد آہیں تو نہیں بھر رہا۔'' توصیف بولا۔

''ہوسکتا ہے آپ کو آہیں بھرنے کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔'' جمیل فوراً بولے اور توصیف کو دل ہی دل میں خیال آیا کہ شاید وہ اتنے گھامڑ نہیں تھے جتنا وہ انہیں دل ہی دل میں سمجھتا آیا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ ایک لمحے کے لئے بالکل سنجیدہ ہو گیا۔

''آپ یہاں کیسے آئے جمیل صاحب؟'' اس نے اپنی دانست میں موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"میں تو آتا رہتا ہوں........مجھے اکثر یہاں کام پڑتا رہتا ہے۔" جمیل نے مبہم سے لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا تو پھر آپ اپنا کام کیجئے اور مجھے اجازت دیجئے۔" توصیف مسکراتے ہوئے بولا اور مصافحہ کرنے کے بعد اطمینان سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ٹہلنے کے سے انداز میں آگے چل پڑا۔

باہر آکر اس نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ نایاب کی کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اور اس جگہ تک آیا جہاں نایاب نے گاڑی چھوڑی تھی۔ نایاب کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ اسکا مطلب تھا کہ وہ گاڑی تک پہنچ چکی تھی اور گاڑی لے کر جا چکی تھی۔

توصیف نے اطمینان کی ایک اور سانس لی اور اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دفتر پہنچ کر وہ ابھی کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی موبائل کی

گھنٹی بجی۔ دوسری طرف نایاب تھی۔

''آپ دفتر پہنچ گئے؟'' اس نے نیچی اور محتاط آواز میں پوچھا۔

''ہاں میں ابھی آ کر بیٹھا ہی ہوں۔'' توصیف نے جواب دیا۔

''آج تو بال بال بچے ہیں........'' نایاب گہری سانس لے کر بولی۔

''واقعی......اس نے تسلیم کیا۔'' لیکن ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ بچے بھی ہیں یا نہیں۔

''کک......کیا مطلب۔'' نایاب کی لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''یہ شخص جمیل بہت ہی کمینہ آدمی ہے۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جن سے اچھائی کی توقع کم ہی رکھی جا سکتی ہے۔

''آپ سے زیادہ وہ مجھے ناپسند ہے۔'' نایاب بولی ''موصوف مجھے دیکھ کر کچھ ریشہ خطمی سے ہو جاتے ہیں۔ کئی بار سلام دعا سے آگے بات

بڑھانے کی کوشش کر چکے ہیں۔"

"ان کی گفتگو سے اندازہ تو ہو رہا تھا کہ موصوف تمہارے دلدادہ ہیں۔" توصیف بولا "میرے خیال میں اس میں اس کا کچھ ایسا زیادہ قصور نہیں ہے..........تم آخراتنی خوبصورت اور دلکش کیوں ہو؟ زیادہ خوبصورتی اور دلکشی انسان کے لئے مسئلہ تو بنتی ہے ناں۔"

"اب میں کیا کروں......" وہ دھیرے سے مخمور انداز میں ہنسی "مجھے اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ لیکن میں تمہیں مزے کی ایک بات بتاؤں کہ یہ موصوف جمیل صاحب اپنے آپ کو کسی ہیرو سے کم نہیں سمجھتے۔ کبھی گلی میں آتے جاتے وقت کہیں خواتین کو کھڑے دیکھ لیں تو بالوں میں ہاتھ پھیر کر ایسے نشیلے انداز میں دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں کہ ان کے جانے کے بعد خواتین دیر تک ہنستی رہتی ہیں۔

"ہاں بھئی........اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا رہنا ہر انسان کا

بنیادی حق ہے۔'' توصیف ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''بہر حال ہم آئندہ اس ہوٹل میں نہیں ملیں گے'' نایاب نے فیصلہ سنایا'' وہ ہے بھی شہر کے وسط میں۔ وہاں جان پہچان والوں سے سامنا ہونے کا زیادہ امکان ہے۔''

''میں خود تم سے یہی کہنے والا تھا۔'' توصیف بولا'' ویسے بھی جمیل بتا رہا تھا کہ وہاں تو اس کا آنا جانا رہتا ہے، ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اب تک اس کی نظر سے بچے ہوئے تھے۔'' پھر اس نے ایک ہوٹل کا نام لیا جو اندرون شہر سے کافی دور ائیر پورٹ کے نزدیک تھا۔'' آئندہ کیلئے ہماری ملاقات وہاں ہوگی پہلے کی طرح ہم کسی مقررہ جگہ پر پہنچ کر اکٹھے وہاں کیلئے روانہ ہوا کریں گے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' نایاب سے اتفاق کیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

چوری چھپے کی ان ملاقاتوں کے علاوہ بس اسٹاپ پر بھی ان کی

ملاقاتیں جاری تھیں۔ اب وہ بچوں کو سوار کرانے کے بعد اطمینان سے دو تین منٹ بات کر لیتے تھے۔ دو تین مرتبہ تو انہیں ملاقاتوں میں ہوٹلوں کی ملاقاتوں کا پروگرام بنا۔

دوسرے روز وہ اسی طرح بچوں کو بس میں سوار کرا کے باتیں کرنے لگے اور شاید چند لمحوں کے لئے گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے تھے۔ وہ اس وقت چونکے جب انہوں نے نیلے رنگ کی ایک بڑی سی پک اپ اپنے قریب رکتی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے اسی کھڑکی سے جمیل کا چہرہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ اس کی چہرے پر بظاہر مہذبانہ سی مسکراہٹ تھی لیکن درحقیقت اس مسکراہٹ کے آڑ میں خباثت چھپی ہوئی تھی۔

''ماشاءاللہ .... کتنے اچھے لگ رہے ہیں آپ دونوں سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے، بس اسٹاپ پر، کالج کے کسی لڑکے لڑکی کی طرح۔'' وہ پان چبا رہا تھا اور پیک باچھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ

کھڑکی سے سر ذرا اور باہر نکال کر سڑک پر گلگاری کرنے لگا پھر ہونٹوں پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''ویسے توصیف صاحب! مذاق سے قطع نظر ماشاءاللہ نایاب بیگم کے ساتھ آپ کی جوڑی جچتی خوب ہے۔''

وہ دونوں دم بخود کھڑے تھے۔ اس وقت تو دونوں ہی چوکڑی بھول گئے تھے توصیف ذرا سنبھلتے ہوئے بولا ''وہ ہم بچوں کو بس میں سوار کرانے آتے ہیں تو سلام دعا ہو جاتی ہے اس پر یہ جوڑی وغیرہ کی بات کرنا بہت نامناسب ہے۔''

''ارے صاحب........ مناسب اور نامناسب کی بحث بہت لمبی ہے'' جمیل مصنوعی بے پرواہی سے بولا ''کبھی کبھی تو یونہی سر راہ چلتے چلتے بہت سی نامناسب باتیں انسان کے علم میں آ جاتی ہیں۔ اب مثلاً کل کے ہی واقعہ کو لے لیجئے...... جو ہوٹل میں آپ سے ملاقات

ہوئی تھی، وہاں میری بڑی واقفیت ہے میرا وہاں بڑے عرصے سے سپلائی کا کام چل رہا ہے بیروں سے لے کر جی ایم تک سب مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں تو یونہی تھوڑا سا ذکر کیا تو پتا چلا کہ کل وہاں لیڈیز کلب کی کوئی میٹنگ نہیں تھی اور مزید پتہ چلا کہ آپ دونوں معزز خاتون وحضرات اکثر حیدر آباد سے آنے والے میاں بیوی کی حیثیت سے وہاں قیام فرماتے رہتے ہیں۔"

دفعتاً توصیف کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے نایاب کی طرف دیکھا اس کا چہرہ بھی فق تھا۔ حالانکہ وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی اور ہر قسم کی صورتحال میں خود پر قابو رکھتی تھی لیکن اس وقت یقیناً اسکی بھی سٹی گم تھی۔

"جمیل نے گویا ان پر ترس کھاتے ہوئے انہیں مزید ذہنی اذیت نہیں دی اور مزید اعصابی تناؤ میں مبتلا نہیں کیا۔ ایک استہزائیہ سا قہقہہ لگا

کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی مگر اس قہقہہ میں بہت سے ان کہے پیغام چھپے ہوئے تھے۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس راز کو اپنے دل میں نہیں رکھے گا اور اپنے کسی مقصد کے لئے استعمال کرے گا۔ وہ ویسے ہی ایک کمینہ تنگ دل، اور دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

''بہت ہی کمینہ ہے یہ قصاب کا بچہ......! توصیف غصے سے بولا۔

جمیل کے جانے کے بعد وہ سنبھلا تو اس کے دل میں غصے کی ایک لہر ابھری تھی۔ ''اسے کیا حق ہے دوسروں کی نجی زندگی میں دخل دینے کا۔

''اسے برا بھلا کہنے اور اس کے خاندانی پس منظر کو طعنہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔'' نایاب خوفزدہ لہجے میں بولی۔

میں اس کا منہ بھی توڑ سکتا ہوں۔'' توصیف کچھ اور غصے سے بولا۔

''یہ تو اور بھی برا ہوگا........ لوگ سر راہ ہماری رسوائی کا تماشہ دیکھیں

گے۔اب ہمیں اپنے تعلقات کے بارے میں فیصلہ کن انداز میں سوچنا ہوگا۔'' نایاب سخت فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔

''ہم آئندہ اسی ائیرپورٹ والے ہوٹل میں ملیں گے'' جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا۔'' توصیف بولا۔

''میرا تو خیال ہے کہ اب ہم نہ ہی ملا کریں تو اچھا ہے'' نایاب نے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے ! تمہیں معلوم ہے ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے'' توصیف پرزور لہجے میں بولا'' اور تمہیں اس کمینے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں اس سے میں نمٹ لوں گا۔'' اس کے اندر کا مرد پوری طرح بیدار تھا جو خوفزدہ محبوبہ کو تحفظ کا احساس دلانا چاہتا تھا، اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ ایک مضبوط مرد کی پناہ تھی۔

''ہم چور ہیں، ہم غلطی پر ہیں، ہم اس کے سامنے کس طرح اکڑ سکتے

ہیں؟'' وہ افسردہ لہجے میں بولی اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اس وقت وہ زیادہ دیر کے لئے اسٹاپ پر نہیں رک سکتی تھی۔

اس روز توصیف دن میں فون کر کے بڑی مشکل سے اسے ایئر پورٹ والے ہوٹل میں ملاقات کے لئے آمادہ کیا۔ جب وہ آئی تو نہایت سنجیدہ.......... یا پھر شاید رنجیدہ تھی۔ وہ دوسرا روز تھا اور ایک ہی رات میں اسکی کنول سی آنکھوں کے نیچے ہلکے سے حلقے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی خوش مزاجی گرم جوشی اور زندگی سے بھرپور ہنسی جیسے ایک رات میں قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ وہ گویا بادل نخواستہ ملنے کے لئے آگئی تھی لیکن اس ملاقات میں کوئی رنگ بھرنا اسکے بس میں نہیں رہا تھا۔

نہایت بوجھل سی سنجیدگی کے ساتھ وہ بولی ''توصیف! میں نے اس معاملے پر بہت سوچا ہے...... ساری رات میں جاگتی رہی ہوں اور

مسلسل سوچتی رہی ہوں......میں پوری رات سو نہیں سکی مجھے بھی اعتراف ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہمارے تعلقات کی کہانی اب خفیہ نہیں رہے گی۔ جمیل اگر بیچ میں نہ بھی آتا تو تب بھی شاید یہ راز سامنے آ ہی جاتا بس ذرا زیادہ دیر لگ جاتی۔ کوئی بھی چوری ہمیشہ راز نہیں رہتی۔''

توصیف بیڈ پر نیم دراز ایک ٹک اسکی طرف دیکھے جا رہا تھا وہ مرتعش سے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی ''اس سے پہلے کہ یہ کہانی میرے شوہر اور تمہاری بیوی تک پہنچے ہمیں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا..........بلکہ یوں سمجھو کہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے اب میں تمہارا فیصلہ سننا چاہتی ہوں۔''

''تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' توصیف نے فوراً پوچھا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔

''میں نے سکندر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' نایاب نے سر جھکا کر گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''تم........تم اس سلسلے میں کیا اقدام کرو گی؟'' توصیف نے سرگوشی میں پوچھا۔

''میں اس سے درخواست کروں گی کہ وہ مجھے طلاق دے دے تا کہ بچے مجھے مل سکیں۔''

''قبل از وقت میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' نایاب نے گہری سانس لے کر کہا'' ہوسکتا ہے وہ اس پر آمادہ نہ ہو اور طلاق نہ دے لیکن میں نے کہا نہ کہ میں فیصلہ کر چکی ہوں اسے چھوڑ دوں گی یا پھر اس سے خلع لے لوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس صورت میں بچے مجھے نہ ملیں۔ میں نے اپنے آپ کو اس صورتحال کے لیے بھی تیار کر لیا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ اپنی اس سنگدلی کے ساتھ زندہ رہ سکوں۔''

''وہ یکلخت خاموش ہوگئی آواز اس کے گلے میں اٹکنے لگی تھی چند لمحے بعد گویا کوئی چیز زبردستی حلق سے نیچے اتار کر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں بولی ''عشق میں واقع آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ فیصلہ میرے لئے بڑی ذلت کا باعث بنے گا لیکن مجھے لگتا ہے کہ دو کشتیوں کی سوار بن کر میں اس سے کہیں زیادہ ذلت اٹھاؤں گی۔ یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد ہم کم از کم یکسو تو ہو جائیں گے۔ زندگی بھر کے احساس جرم اور احساس گناہ سے تو نجات مل جائے گی۔

توصیف دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نایاب نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں کھنڈروں جیسی ویرانی تھی۔ وہ اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا وہ دھیمے لہجے میں بولی ''اب تم بتاؤ.........تم کیا کہتے ہو؟''

''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' توصیف گویا اسکی آزمائش کے لئے تیار

نہیں تھا۔

نایاب نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا اور بولی تو اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا" میں کیا چاہتی ہوں.......... مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہیں اس قسم کے سوال کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ خیر......... تو سنو میں کیا چاہتی ہوں دیکھو توصیف صاحب میں عورت ہو کر اتنی بڑی قربانی دے رہی ہوں...... اتنا بڑا اقدم اٹھا رہی ہوں۔ میں اس کے جواب میں تم سے بھی قربانی ہی چاہوں گی۔ میں دوسری بیوی بن کر نہیں رہ سکتی جب میں اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی ہوں تو اس سے تجھے اندازہ ہو جانا چاہئے کہ میرے عشق میں کتنی شدت ہے اور اتنی شدت سے عشق کرنے والے اپنا عشق شیئر نہیں کرتے۔

توصیف گم صم بیٹھا اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہے جبکہ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا جو نایاب کہہ

رہی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسی مسئلے پر محض سوچنا اور اس سے نتائج اخذ کرنا یا صرف ارادے باندھنا آسان ہے۔ کسی مشکل فیصلے پر پہنچنا اس پر عملدرآمد کس قدر کٹھن مرحلہ ہے یہ اسے اب معلوم ہو رہا تھا۔

توصیف خاموش رہا تو نایاب بولی" اس سے پہلے کہ بات کسی طرح میرے شوہر تک پہنچے مجھے آپ کا جواب چاہئے ہوگا ورنہ بس یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ آج کے بعد ہم کبھی نہیں ملیں گے .... پھر اگر جمیل نے ہمارے گھر میں آگ بڑکانے کی کوشش بھی کی تو میں اس کا مقابلہ کرنے اور اسے جھٹلانے کی پوری کوشش کروں گی۔

........گو کہ یہ ایک مشکل کام ہوگا مرد کے دل میں خصوصا سکندر جیسے کے دل میں شک کا بیج ڈالنا بہت آسان کام ہے۔"

توصیف پھنسی پھنسی آواز میں بولا" مجھے سوچنے کیلئے کچھ وقت دو

.........میں تجھے خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ عورت ہوتے ہوئے تم نے ایک رات میں اتنا بڑا فیصلہ کرلیا مجھے مرد ہوتے ہوئے شاید اس سے زیادہ وقت لگ جائے۔''

''مجھے یہ سن کی افسوس ہوا۔'' نایاب سر جھکاتے ہوئے مجروح سے لہجے میں بولی'' مجھے شاید خوش فہمی تھی کہ آپ کو فیصلہ کرتے ہوئے چند منٹ بھی نہیں لگیں گے لیکن خیر.........میں آپ سے شکوہ نہیں کروں گی۔شاید اس معاملے میں ''دیر آید درست آید'' والی بات درست ہو لیکن ایک دو دن سے زیادہ دیر مت لگایئے گا۔یہ جمیل مجھے خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے.........اور مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں بھی میری شدید طلب موجود ہے۔اسے تو گویا مجھے بلیک میل کرنے کا یہ موقع خوش قسمتی سے مل گیا وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا.........اور میں کسی قیمت پر اس کے ہاتھوں بلیک میل

نہیں ہونا چاہتی۔''

''تم اپنے ذہن میں اتنا بوجھ مت لو........سب ٹھیک ہو جائے گا

''توصیف نے اسے مبہم سی تسلی دی گو کہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ سب کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔

ہوٹل کی اس بے کیف اور پر تشویش ملاقات کے بعد وہ دفتر چلا گیا۔ شام ڈھلنے تک کافی مصروفیات رہیں۔ کچھ اہم کلائنٹس ملنے کے لئے آ گئے ان کے ساتھ سائیٹ پر بھی جانا پڑا۔ شام کو جب وہ تھکا ہارا پراگندہ ذہن لئے گھر پہنچا تو ایک اور دھچکا اس کا منتظر تھا۔ اسنے نایاب کو تسلی دی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن درحقیقت سب کچھ بگڑ چکا تھا۔

گھر اسے مقفل ملا۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ اسکی بیوی کو کبھی کبھی بچوں سمیت کسی کام سے جانا پڑ جاتا تھا تو وہ تالا لگا کر چلی جاتی

تھی۔توصیف کے پاس چابی موجود رہتی تھی لیکن جب وہ اندر پہنچا تو اسے گھر میں کچھ اور طرح کا سونا پن محسوس ہوا۔اسکی کوئی حس اسے بتا رہی تھی کہ ستارہ کہیں آس پاس یا مارکیٹ تک نہیں بلکہ کہیں اور گئی ہوئی تھی۔ پھر اسنے ادھر ادھر کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا ستارہ اور بچوں کا زیادہ تر سامان بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔

پھر اس کی نظر ڈائینگ ٹیبل پر ایش ٹرے کے نیچے رکھے ہوئے اس خط پر پڑی۔اس نے اٹھایا تو اس کا دل بے عنوان اندیشوں سے دھڑک رہا تھا۔وہ ستارہ کا خط تھا اس نے لکھا تھا۔

''میرے.........(کیا واقعی میرے؟) توصیف !

آج ایک عجیب سی بات ہوئی۔دوپہر کے قریب گھر پر ایک فون آیا کہ آپ کا شوہر اس وقت ائیر پورٹ کے قریب ایک ہوٹل کے کمرہ نمبر فلاں میں ایک عورت کے ساتھ موجود ہے۔اگر آپ وہاں جا کر

دستک دینے کا حوصلہ نہ رکھتی ہوں تو ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد باہر ہی کہیں موجود رہ کر دیکھئے گا' وہ دونوں آپ کو وہاں سے نکلتے نظر آجائیں گے۔

آج گو فرسٹ اپریل نہیں تھی لیکن میں نے اسے کسی کا سنگین مذاق ہی سمجھا۔ مگر دل میں کھد بھد رہی۔ آخر کار میں نہ رہ سکی اور میں نے گاڑی نکالی اور وہاں پہنچی۔ میں نے پارکنگ لاٹ میں تمہاری گاڑی دیکھ لی لیکن اس کے باوجود دل کو طفل تسلیاں دیتی رہی کہ وہ فون کال مجھے بہکانے اور پریشان کرنے کیلئے تھی۔ کاموں کے سلسلے میں تمہارا آنا جانا ہوٹلوں میں رہتا ہی ہے میں دوسری گاڑیوں کی آڑ میں ایک طرف کھڑی رہی۔

اور آخر کار میری خوش فہمیوں کے سارے تاج محل زمین بوس ہو گئے میں نے تمہیں نایاب کے ساتھ ہوٹل سے نکلتے دیکھ لیا۔ میں اسے

جانتی ہوں بے شک بڑے غضب کی عورت ہے لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ اپنے شوہر اور بچوں سے اس کا بندھن اتنا کچا ہوگا.......میں اسے ایک شریف عورت اور باوقار بیوی سمجھتی تھی۔ مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اگر اس کی زندگی میں کوئی کمزور لمحہ آبھی گیا تب بھی وہ کسی اور شادی شدہ اور بچوں والی عورت کے گھر میں نقب لگائے گی۔

''توصیف ! میں آپ کے اچھے برے ہر وقت کی ساتھی ہوں۔ میں نے صحیح معنوں میں آپ کو مجازی خدا کا درجہ دیا۔ آپ کی ہر خوشی کا خیال رکھا سر جھکا کر گھر داری میں لگی رہی۔ دولت مند اور انتہائی فیشن ایبل عورتوں اٹھنے بیٹھنے کے باوجود ان کی عادات نہیں اپنائیں۔ ہمیشہ آپ کا بوجھ بٹایا۔ آپ کو خود اندازہ نہیں ہوگا اور شاید یاد بھی نہیں ہوگا کہ بارہا آپ پر چڑچڑاہٹ اور پریشانیوں کے دور گزرے مگر میں ہنس ہنس کر سب کچھ سنتی رہی۔

میں روایتی بیوی نہیں بننا چاہتی تھی جو گھر میں جواباً شوہر سے بھی زیادہ چیخ چیخ کرتی ہیں میں تنک مزاج ہوا کرتی تھی مگر شادی کے بعد آپ کی خاطر.........آپ کی محبت میں بہت دھیمی ہو گئی۔

آپ.........یہ گھر.........یہ بچے.........بس یہی میری کل کائنات تھی اور میں نے اپنے آپ کو انہی کے درمیان گم کر لیا تھا۔

میں اس مثلث میں مگن تھی مگر آج.........مگر میں آج دھڑام سے قوس وقزاع کی بلندیوں سے گری ہوں۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ میرا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ازدواجی زندگی کے صرف نو برس نہیں اپنی پوری زندگی آپ پر وار دی تھی.........مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آپ کی زندگی میں آنے سے پہلے بھی میں کچھ تھی مگر میں تو ایک سراب میں تھی یہ مجھے آج احساس ہوا تھا۔

آپ کو شاید اندازہ ہی نہیں ہے کہ گھر میں اطاعت شعاری سے زندگی

گزارنے والی یہ تحمل مزاج دھیمی اور کم گوسی عورت آپ کو کن شدتوں سے چاہتی ہے........اور اس چاہت کی بنیاد میاں بیوی کا معتبر رشتہ ہے۔اس کی بنیاد محض ہوس اور خواہش نہیں۔جس کی محبت اتنی شدید ہوتی ہے اس کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے........اور پھر صدمہ بھی تو کچھ کم شدید نہیں۔.........اب تو مجھے آپ پر اعتبار بھی نہیں رہا۔ماضی میں بھی نہ جانے کتنی رنگین کہانیاں آغاز اور اختتام کو پہنچی ہوں گی۔میں تو کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔شاید اس لئے بے خبر تھی۔

مگر بس..........اس سے آگے کچھ نہیں ہوگا۔میں بچوں کو لے کر میکے جارہی ہوں آپ ٹھنڈے دل سے سوچیئے اچھی طرح سوچیئے میں آپ کو ایک ہفتے کی مہلت دے رہی ہوں۔اگر آپ کو میری اور بچوں کی ضرورت ہے تو ایک ہفتے بعد آکر ہمیں لے جایئے

........لیکن دل صاف کر کے اور کڑا کر کے آیئے گا کیونکہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے سے پہلے آپ کو قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا پڑے گی کہ آئندہ آپ اس عورت سے........اور کسی بھی عورت سے کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں رکھیں گے........ورنہ میں وہیں ٹھیک ہوں آپ مجھے آزاد کر دیجیئے گا اور اس نئے انداز میں اپنی دنیا سجا لیجیئے جو آپ کو پسند ہے۔''

خوش فہم

''ستارہ''

خط پڑھ کر توصیف کو چکر سا آ گیا۔

جب اس کی حالت سنبھلی تو اس نے کئی بار خط کو پڑھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ستارہ بھی ایسا خط لکھ سکتی ہے اور اسے آزمائش کے ایسے دوراہے پر کھڑا کر سکتی ہے۔ پھر اسے جمیل کا خیال آیا۔ اس نے

سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ شخص اتنا مکار، عیار، سازشی اور خطرناک ثابت ہوگا۔ اس نے یقیناً نایاب پر نظر رکھی تھی یا اس کی نگرانی کرانے کا کوئی بندوبست کیا تھا اور پھر اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

ایک محاذ پر........ یعنی توصیف کے گھر میں تو اس نے اپنا کام دکھا دیا تھا لیکن دوسرے محاذ پر، یعنی نایاب کے گھر میں اس نے کوئی چال کیوں نہیں چلی تھی؟ کیا اس لیے اس نے کوئی اور بھی زیادہ خطرناک منصوبہ سوچا ہوا تھا؟ یا کہیں وہ وہاں بھی اپنا وار کر تو نہیں چکا تھا؟ اس نے نایاب کے شوہر کو بھی تو یہ بات نہیں بتا دی تھی؟

وہ وقت ایسا تھا کہ توصیف اس کے گھر فون کر کے اس سلسلے میں معلومات بھی نہیں کر سکتا تھا اسے معلوم تھا کہ سکندر گھر آ چکا ہوگا۔ وہ رات اس نے جاگتے ہوئے اور سوچتے ہوئے گزار دی۔ اس رات اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ نایاب پر پچھلی رات کیا گزری

ہو گی۔

دوسرے روز وہ تیار ہو کر ایک ریستوران سے ناشتہ کر کے بجھے ہوئے دل کے ساتھ دفتر پہنچا۔ بچے تو تھے نہیں جو انہیں چھوڑنے سٹاپ پر جاتا۔ اس کے باوجود وہ مقررہ وقت پر وہاں گیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا کہ اس روز نایاب کے بچوں کو چھوڑنے اسکی ملازمہ آئی تھی۔ وہ اس سے نایاب کے بارے میں پوچھنے کی جرات نہ کر سکا۔

دفتر پہنچ کر طرح طرح کے اندیشے اور خطرات اسے گھیرے رہے۔ مخصوص وقت پر اس نے دفتر سے نایاب کو ذرا ڈرتے ڈرتے فون کیا۔ فون نایاب ہی نے رسیو کیا۔ تو صیف کی کچھ جان میں جان آئی۔

''آج تم اسٹاپ پر نہیں آئیں؟'' اس نے پوچھا۔

''مسلسل اعصابی تناؤ اور نیند کی کمی نے مجھے، مضمحل اور بیمار سا کر دیا

ہے میں خواب آور گولی کھا کر سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لئے بچوں کو ملازمہ سے ہی تیار کروا کر اسی کے ساتھ بھیجا تھا۔'' نایاب نے کمزور سے لہجے میں بتایا۔

''سکندر کے رویے میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟''

توصیف نے پوچھا۔

''فی الحال تو کوئی تبدیلی نہیں آئی...... لیکن میں کسی بھی لمحے کسی بم کے پھٹ جانے کی منتظر ہوں۔ اگر سکندر کو اچانک ہی کچھ زیادہ غلط سلط اور بھڑکانے والے انداز میں یہ بات بتائی گئی تو ان کا ردعمل شدید بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اگر تمہیں میرے جان سے مارے جانے کی اطلاع ملی تو تم کیا کرو گے؟''

''میں سکندر علی کو قتل کر دوں گا۔'' توصیف بے ساختہ بولا'' اگر اس نے تمہیں ذرا سی بھی گزند پہنچائی تو میں واقعی ہی اسے قتل کر دوں گا۔''

”بالکل ٹھیک۔“ نایاب کے چہرے پر کچھ بشاشت جھلک آئی ”میرے قاتل کو صرف چار چھ سال کے لئے جیل نہیں جانا چاہئے۔ میری جان کے بدلے میں اسکی بھی جان ہی جانی چاہئے۔“ پھر اس نے پوچھا ”تمہاری طرف کیا حال ہے؟“

”میری طرف تو بازی ہی پلٹ چکی ہے۔“ توصیف نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”پھر اسے سب کچھ بتادیا اور پھر ستارہ کا سارا خط ہی پڑھ کر فون پر سنایا۔

دوسری طرف چند سیکنڈ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ نایاب گویا سناٹے میں آگئی تھی۔ پھر کچھ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی ”ہوا تو یہ بہت برا ہے لیکن جو کہانی ہم نے شروع کی ہے یا یوں کہو کہ جس کہانی کی جذباتی بہاؤ میں ہم ارادی اور غیر ارادی طور پر بہہ گئے ہیں اس میں ایسے موڑ تو آنے ہی تھے.........ایسی ہی

باتوں کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ ایک لحاظ سے شاید یہ اچھا بھی رہا۔ ان تمہیں جلدی فیصلہ کرنے میں آسانی بھی رہے گی۔ میں بھی کشمکش کی سولی پر مصلوب ہوں۔ میں اس سولی پر سے اترنا چاہتی ہوں۔ اب یا تو ہمیں ہمیشہ کے لئے ایک ہو جانا چاہئے یا پھر اس سلسلے کو یہیں ختم کر دینا چاہئے۔''

''ہاں.........شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' توصیف بے یقینی سے بولا۔ درحقیقت بیوی کی حد تک تو اس کے لئے بھی فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ اس سے شرمندہ ضرور تھا اور اسکی خوبیوں کا معترف بھی تھا لیکن اس کے لئے کوئی ایسی طوفانی یا شدید قسم کی محبت اس کے دل میں نہیں تھی لیکن بچوں کے بارے میں سوچ کر اس کا دل کٹنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب طلاق کا معاملہ چلا اور عدالت میں بچے ماں کو دے دئے اور باپ کو صرف مقررہ اوقات میں محدود سے انداز

میں ان سے ملنے کی اجازت دی، ملاقاتوں کا کوٹا مقرر کیا تو یہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔

اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ابھی سے یہ خیال سر ابھار رہا تھا کہ بچوں کو مکمل طور پر اپنی تحویل میں لینے کے لئے وہ مقدمے بازی کرے گا۔

''میرے پاس ایک ہفتے کی مہلت ہے۔''توصیف نے رسیور میں کہا۔

''ہو سکے تو اس سے پہلے فیصلہ کرنے کی کوشش کرو۔''نایاب ملائمت سے بولی'' کہیں اس دوران میں میری طرف بات نہ بگڑ جائے۔''

''ہوں......''توصیف نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں ہنکارا بھرا۔

''نایاب کہتی رہی''جمیل ہماری توقعات سے زیادہ خطرناک آدمی

ثابت ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں وہ اس طرف کیا چال چلے گا۔ مجھے تمہارا فیصلہ پہلے سے معلوم ہونا چاہئے۔ تا کہ میں اس کی مناسبت سے صورتحال کا سامنا کرسکوں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ عورت ہونے کے باوجود وہ اپنے محاذ پر دلیری سے جمی ہوئی تھی۔ توصیف قدرے کمزور لہجے میں بولا میں کوشش کروں گا۔''

وہ رات اس کیلئے اپنے گھر میں گزارنی مشکل ہوگئی۔ گھر گویا اسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بیوی اور بچے کس حد تک اسکی زندگی کا حصہ تھے اس رات اسے صحیح طور پر معلوم ہوا کہ اگر وہ نایاب کے بغیر نہیں رہ سکتا تو بیوی بچوں کے بغیر بھی نہ رہ سکتا۔ کم از کم بچے تو اسکی زندگی کا لازمی جزو تھے۔

صبح وہ اٹھا تو اعصابی شکست وریخت کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں

کسلمندی اور اضمحلال تھا۔

اس روز اسے ڈیفنس کے آخری کونے تک بھی جانا تھا۔ جہاں برائے نام کنسٹرکشن ہو رہی تھی۔ ایک صنعت کار وہاں محل نما بنگلا بنوا رہا تھا۔ جس کا نقشہ توصیف کی فرم نے بنایا تھا۔ کچھ ٹیکنیکل مشورے دینے اسے خود جانا تھا۔ بنگلے کی کنسٹرکشن شروع ہو رہی تھی صرف دو تین گھنٹے کا کام تھا۔

توصیف تھکے ہوئے ذہن اور تھکے ہوئے جسم کے ساتھ وہاں پہنچا۔ سیٹھ خود بھی آیا ہوا تھا۔ توصیف نے بڑی مشکل سے اپنا حصے کا کام مکمل کر کے اپنی جان چھڑائی۔ جان اس لیے بھی کچھ جلدی چھوٹ گئی کہ بارش شروع ہو چکی تھی اور بعض کام ملتوی کر دیئے گئے تھے۔

توصیف جب واپس روانہ ہوا تو بارش کافی تیز ہو چکی تھی لیکن توصیف کو اس کا کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ اس کے اپنے اندر ایک اور ہی

طوفان بادوباراں جاری تھا۔ وہ بار بار اپنے اندر ابھرنے والی ایک طاقتور خواہش کو دبانے کی کوشش کررہا تھا۔ خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو لینے چلا جائے۔

اس کی سسرال حیدرآباد میں تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ستارہ جب اچانک بچوں کو لے کر حیدرآباد روانہ ہوئی ہوگی تو وہاں پہنچ کر اسنے اپنے والدین کو وجہ کیا بتائی ہوگی؟ اگر اس نے اصل بات بتادی ہوگی تو بچے ماں باپ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟ ادھر سکول میں بھی ان کے ناغے ہو رہے ہوں گے۔

توصیف حیدرآباد جانے کیلئے تقریبا تیار تھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ ستارہ نے شرط بڑی کڑی رکھی تھی وہ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کیسے قسم کھا سکتا تھا کہ آئندہ وہ زندگی میں کبھی نایاب یا کسی عورت سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا؟ کسی اور عورت کی حد تک تو اسے وعدہ کرنے میں اسے کوئی

مشکل درپیش نہیں تھی لیکن نایاب سے قطع تعلق کرنے کی قسم وہ کیسے کھا سکتا تھا؟

توصیف کی روح اور جسم میں نایاب کی طلب جس شدت سے موجود تھی وہ مسئلہ تو اپنی جگہ پر تھا لیکن اب تو یہ احساس بھی اس کے لئے بڑی آزمائش بن گیا تھا کہ نایاب نے عورت ہوتے ہوئے اس کی خاطر اپنی پرسکون زندگی، گھر، بال بچے........سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔اسے بربادی کے راستے پر ڈال کر وہ مرد ہوتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتا؟اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی تھی؟

دوسری طرف وہ اپنے معصوم بچوں کے بارے میں سوچتا تھا تو اس کے دل میں خنجر سا اتر جاتا تھا ان معصوم بچوں کا کیا قصور تھا کہ انسانی خواہشوں اور مطالبوں کی اس جنگ میں ان کی زندگی برباد کرنے کا آغاز کر دیا تھا؟

ایک طرف وہ سوچ رہا تھا کہ حیدرآباد چلا جائے اور ستارہ کو اس کی شرط سے باز رکھتے ہوئے کسی طرح گھما پھرا کر باتوں باتوں میں منا کر لانے کی کوشش کرے۔ شاید اس کے والدین بھی اس کو سمجھانے میں مدد کریں.........لیکن دوسری طرف کوئی قوت اسے خبردار کرتی تھی کہ اگر وہ حیدرآباد چلا گیا تو اسکے پاس نایاب کی طرف واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ یہ بھی اسے گوارہ نہیں تھا اور یہی وہ کشمکش تھی جس کی چکی میں توصیف پس رہا تھا۔ اس کی رواں رواں اذیت سے فریاد کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے سر جھٹک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ وہ ونڈ اسکرین پر بارش کے پانی کی دھندلاہٹ نہیں تھی کیونکہ وائپر مسلسل چل رہے تھے۔ دھندلاہٹ

اس کی آنکھوں میں آئی تھی اور ڈرائیونگ میں یہ بڑی خطرناک بات تھی۔

دھندلاہٹ صاف ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو ہائی وے پر پہنچ چکا تھا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ وہ کس طرح اور کن راستوں سے ہوتا ہوا ڈیفنس کے آخری سرے سے سپر ہائی وے پر آن پہنچا تھا۔ اس کی گاڑی کا رخ حیدر آباد کی طرف تھا۔ شاید وہاں کسی روح کی پکار، کسی معصوم ذہن کی دعا اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

اس نے نہ تو گاڑی روکی اور نہ ہی اسے واپسی کے لئے دوسری طرف سڑک کی طرف موڑا اس نے اسے یوں محوسفر رہنے دیا جیسے وہ خود بہ خود ہی چلی جا رہی ہو۔ وہ مزید کچھ دیر حرکت میں ہی رہتے ہوئے سوچنا چاہتا تھا لیکن جوں جوں وہ کراچی سے دور ہو رہا تھا کوئی طاقت اسے زیادہ شدت سے واپس کھینچ رہی تھی۔ کشمکش شدید تر ہوتی جا رہی

تھی.........وہ حیدر آباد جائے یا نہ جائے؟ یہ سوال خنجر کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔

اسے شاید احساس بھی نہ ہو سکا کہ لمحہ بہ لمحہ یہ اذیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسکی گاڑی کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ ایکسی لیٹر پر اس کے پاؤں کا خفیف سا دباؤ بڑھتا چلا گیا تھا۔

بارش ہلکی ہو چکی تھی لیکن اب بھی جاری تھی۔ سڑک خوب گیلی تھی۔

ایک مقام پر بیچ میں توصیف کو دو سڑکوں کے درمیان وہ خالی جگہ نظر آئی جس سے گاڑی دوسری طرف سڑک پر موڑی جا سکتی تھی اور واپسی کا رخ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت وہ کراچی سے پچاس ساٹھ میل دور نکل آیا تھا۔ اس نے یکدم ہی واپسی کیلئے گاڑی موڑی۔ اس وقت تک وہ خالی جگہ سے بھی ذرا سا آگے ہی نکل چکا تھا بہر حال گاڑی نے یوٹرن لے لیا لیکن یہ یوٹرن نہایت ہی غلط طریقے سے لیا گیا تھا۔

سڑک پر پھسلن بہت زیادہ تھی گاڑی درمیان کی کچی پٹی پر سے پھسلتی ہوئی دوسری طرف کی سڑک پر چڑھی تو توصیف کے کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔ بری طرح لہراتی ہوئی وہ اچانک ہی سڑک پر آ گئی دوسری طرف سے بسیں اور ٹرک تیز رفتار سے آ رہے تھے۔ ان کے ڈرائیوروں میں سے شاید کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی اسطرح اچانک بھی گاڑی دوسری سڑک سے موڑ سکتا تھا اور پھر گاڑی بھی توصیف کے قابو میں نہیں رہی تھی۔

توصیف نے سب سے آگے والے ٹرک کو ایک عفریت کی طرح اپنے سر پر آتے دیکھا پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اور دنیا اسکی نظر میں تاریک ہوگئی۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ اس کی گاڑی کھلونے کی طرح اچھلی تھی پھر اسے ایک بس نے بھی ٹکر ماری اور جب وہ دوسری طرف نشیب میں جا کر گری تو یوں پچک چکی تھی جیسے وہ کاغذ سے بنی ہوئی

تھی اور کسی نے اسے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو گاڑی کے سارے شیشے چکنا چور ہو کر نہ جانے کہاں کہاں تک بکھر چکے تھے۔ ٹرک اور بس دونوں کی بریکیں چر چرائی تھیں اور دونوں گاڑیاں بری طرح لہرا گئی تھیں۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ دونوں سڑک کے کنارے رکنے میں کامیاب ہو گئیں تھیں۔ اگر توصیف کی کار اچھل کر دوسری طرف نشیب میں نہ جا گرتی تو حادثہ بہت خوفناک ہو سکتا تھا۔ زیادہ مسافروں سے بھری کئی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا سکتی تھیں۔ فی الحال اس حادثے کے نتیجے میں یہ ہوا تھا کہ توصیف جان سے جا چکا تھا۔

توصیف کی گاڑی اس بری طرح تباہ ہو چکی تھی کہ دور سے دیکھنے والوں کو جھرجھری آ رہی تھی۔ ایک بس اور ایک ٹرک کے سامنے حصوں میں کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی اور ان کے کچھ مسافر معمولی سے

زخمی ہوئے تھے۔

توصیف کا چہلم ہو چکا تھا !

زندگی اس طرح رواں دواں تھی۔حتی کہ اس کے بچے اسکول بھی جانے لگے تھے۔حادثے کی خبر ملتے ہی اسکی بیوی، جواب بیوی کی بجائے بیوہ ہو چکی تھی.........بچوں کو لے کر گھر لوٹ آئی تھی۔اور سوئم تک پچھاڑیں کھاتی رہی تھی۔کسی کو نہیں معلوم تھا کہ دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ کو کتنا کوسا تھا کہ کاش وہ حیدرآباد نہ گئی ہوتی۔

.....توصیف کا حادثہ حیدرآباد کی طرف جاتے ہوئے ہوا تھا۔یوں ذہن کی کسی باریک گوشے کو اس احساس سے تسکین تو ملی تھی کہ وہ اسے لینے آرہا تھا یہ اس کی فتح تھی.........مگر بہت مہنگی فتح تھی جسے وہ فتح کرنا چاہتی تھی۔وہ نہیں رہا تھا روتے اور سسکتے ہوئے اس نے بار بار سوچا تھا کہ اس فتح سے تو شکست بہتر تھی۔

آس پاس کے کچھ گھروں میں رہنے والوں کو تو اس حادثے کا علم بھی نہ ہوسکا تھا۔ بہر حال کافی لوگ آئے تھے۔ جنازے میں بھی اچھے خاصے لوگ شریک ہوئے تھے۔ لیکن سوئم کے بعد گلی میں پچھ اسی طرح پہلے سا سکوت چھا گیا تھا جیسے کسی جھیل میں پتھر مارنے سے کچھ ہلچل مچی ہو۔ دائرہ در دائرہ کچھ لہریں ابھریں ہوں اور سطح پھر پہلے جیسی پر سکون ہوگئی ہو۔

نایاب اسے حادثے کی خبر سن کی بستر سے لگ گئی تھی۔ اسکے شوہر نے یہی سمجھا تھا کہ یہ اتفاقیہ بیماری تھی اسے اس کا اصل سبب معلوم نہیں تھا۔ اسے تو توصیف کے حادثے کے بارے میں بھی صحیح طور معلوم نہیں تھا۔ اسنے بس اڑتی اڑتی سی خبر سنی تھی کہ ٹریفک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا لیکن اس نے تفصیل جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

حادثے تو ہوتے رہتے تھے لوگ تو مرتے ہی رہتے تھے۔ کبھی کسی

طرح، کبھی کسی طرح.....یہی زندگی تھی !مرتے رہنا زندگی کا ہی ایک حصہ تھا۔

نایاب بستر سے اٹھنے کے بعد بھی مہینہ بھر گھر سے نہیں نکلی۔اسے ایک عجیب سی چپ لگ گئی تھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر کی دنیا کیسی بدل چکی تھی۔رفتہ رفتہ اس نے گھر سے نکلنا شروع کیا لیکن اب اس نے بچوں کو سکول بس میں سوار کرانے کے لئے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس اسٹاپ پر کھڑے ہونا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔اسے لگتا تھا کہ وہ وہاں گئی تو یادیں اس پر اس طرح حملہ آور ہوں گی کہ وہ سڑک کے کنارے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گی اور شاید اپنے سر میں خاک ڈال لے گی۔

وہ توصیف کے گھر بھی نہیں گئی تھی۔وہ جا بھی نہیں سکتی تھی۔اس میں ستارہ کا سامنا کرنے کی جرات نہیں تھی۔توصیف کے چہلم کو بھی کئی

دن گزر چکے تھے تو رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ اس پر جمی ہوئی برف گویا دھیرے دھیرے پگھلنے لگی۔ اس روز وہ مین مارکیٹ سے کچھ خریداری کر کے گاڑی میں بیٹھنے لگی تو اسے گاڑی کی دوسری طرف ایک سوٹڈ بوٹیڈ مگر کافی بدشکل سا شخص کھڑا مسکراتا نظر آیا۔

وہ اپنی غائب دماغی پر خود بھی حیران رہ گئی جب کئی سیکنڈ بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ جمیل تھا............ اسے خود پر حیرت اس لئے تھی کہ درحقیقت یہی شخص تو، توصیف کی موت اور اسکی دنیا کی بربادی کا ذمے دار تھا اور وہ اسی کو اب تک بھولی ہوئی تھی۔ وہ یوں اس سے مخاطب ہوا جیسے ان کے درمیان پرانی شناسائی تھی۔

''ذرا دروازہ تو کھولئے۔''

''کیوں؟'' نایاب نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھوں گا۔ جمیل باچھیں کھلا کر بولا۔

''مگر کیوں......؟''

''مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''مجھ سے.........؟ضروری باتیں........؟'' نایاب حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی، پھر افسردگی سے مسکرائی ''کیا اب بھی کوئی بات باقی رہ گئی ہے؟''

''میرے لئے تو اصل بات اب ہی شروع ہوگی۔'' جمیل ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

نایاب نے ایک لمحے سوچا پھر دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ جمیل اپنے بھاری بھرکم جثّے کے ساتھ دھم سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر گویا آن گرا۔ اس کا سوٹ بھی اچھا تھا اسکے جسم سے کلون کی مہک بھی اٹھ رہی تھی۔ اس کے باوجود نایاب کو اس سے ایک عجیب سی کراہت محسوس ہوئی تھی

”گاڑی اسٹارٹ کر لیجئے اور ذرا آس پاس کی سڑکوں پر چلتی رہیے۔ ہم ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہوئے ہی بات کریں تو اچھا ہے“

وہ باقاعدہ اسے ہدایات دے رہا تھا گویا اس کے پاس کوئی تحکمانہ رویہ اختیار کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ موجود تھی۔

نایاب نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا پھر ٹھنڈی سانس لے کر گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ گاڑی مین روڈ پر آ کر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوگئی تھی تو وہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔

”جی.........فرمایئے!۔“

”آپ کو اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ میں نے اب تک توصیف سے آپ کے تعلقات کے بارے میں آپ کے شوہر کو کیوں نہیں بتایا؟“ جمیل بولا۔

”مجھے اس کا خیال نہیں آیا۔ میں اس دوران میں کسی اور ہی دنیا میں

رہی ہوں.........اور اب تو بے چارہ توصیف اس دنیا سے ہی رخصت ہو چکا ہے کیا اسکی جواں مرگی سے بھی آپ کے دل میں ٹھنڈک نہیں پڑی؟ نایاب نہایت دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''اس کی موت سے بھی اس معاملے کی سنگینی کم نہیں ہوئی۔''

جمیل عجیب سے لہجے میں بولا۔

''میں اب بھی آپ کے شوہر کو مطلع کر سکتا ہوں کہ آپ کے اس شخص سے کیسے مراسم تھے........کہاں کہاں آپ اس سے ملتی تھیں میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ آپ کے لئے اس کا نتیجہ اب بھی وہی نکلے گا جو توصیف کی زندگی میں نکلتا۔''

''یعنی؟'' نایاب نے نہایت پرسکون انداز میں وضاحت چاہی۔

''یعنی سکندر آپ کو طلاق دے دے گا۔ بد چلنی کے الزام کی وجہ سے بچے بھی آپ کی تحویل میں نہیں آئیں گے اور ممکن ہے کہ سکندر آپ

سے بہت برا سلوک بھی کرے۔ میری طرح آدمی وہ بھی سخت مزاج ہی لگتا ہے۔'' جمیل گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا۔

''اور آپ چاہیں تو یہ سب کچھ نہیں ہوگا؟'' نایاب کی انگلیاں اسٹیرنگ وہیل پر رقصاں تھیں۔

''بے شک......... کچھ سوچ کر ہی تو میں نے اب تک زبان بند رکھی ہے۔''

''اور آئندہ بھی آپ کی زبان بند رہنے کی کیا شرط ہوگی؟''

''آپ اتنی بھولی نہیں ہیں، سب سمجھتی ہیں........... آپ کو بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں ہم بھی آپ کے چاہنے والوں میں سے ہیں۔ ہم سے بھی میل ملاقات رکھ کر دیکھیں۔ ہم میں کیا خرابی ہے؟ ہم بھی ہفتے میں دو چار گھنٹوں کے لئے بڑے بڑے ہوٹلوں میں قیام افورڈ کر سکتے ہیں۔''

''بہت خوب......!'' نایاب نے اسکی طرف دیکھ کر تفہیمی سے انداز میں سر ہلایا وہ بالکل پر سکون نظر آ رہی تھی۔ اور جمیل کا مطالبہ سن کی پریشان نہیں ہوئی تھی۔ جمیل کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔ اسے اپنی منزل رسائی میں دکھائی دے رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نایاب نے پوچھا'' جمیل صاحب آپ نے زندگی میں کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

''بہت مرتبہ!'' جمیل نے فخر سے جواب دیا۔

''بہت خوب........بہت خوب........!'' نایاب نے ایک بار پھر سر ہلایا'' اور کبھی کسی نے آپ سے محبت کی ہے؟''

''ارے........کیا پوچھتی ہیں بہت عورتوں نے ہم سے محبت کی ہے؟'' کچھ عرصے بعد شاید آپ بھی کرنے لگیں۔'' جمیل تمام تر شیخی سے بولا۔

''بہت خوب........بہت خوب انسان کو جھوٹ اسی ڈھٹائی سے ہی بولنا چاہئے اور اپنی جہالت پر اسطرح ہی فخر کرنا چاہئے'' نایاب بولی ''میں محبت کے معاملہ میں آپ جتنی خوش نصیب نہیں رہی۔صرف دو مرتبہ محبت کر سکی.........صرف دو مرتبہ ہی محبت پا سکی..........بلکہ یوں کہئے کہ درحقیقت محبت تو زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہی ہوئی تھی ....صرف ایک مرتبہ ہی ملی تھی دوسری مرتبہ تو محبت کی تاریخ نے ذرا مختلف انداز میں خود کو دہرایا تھا''

جمیل منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کا موٹا سا نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا اور پلکیں نم آلود دکھائی دے رہی تھیں۔نایاب نے بات جاری رکھی ''لڑکپن میں ایک نوجوان نے مجھے چاہا میں بھی اس سے محبت کرتی تھی وہ بہت معصوم اور پاکیزہ سی محبت تھی........مگر وہ ......وہ اس دنیا میں نہیں رہا اسے قتل کر دیا گیا تھا..........کئی سال بعد

وہ گویا توصیف کے روپ میں واپس آگیا۔ میں ایک بار پھر اس کے سحر میں گرفتار ہوگئی اس بار وقت حالات اور عمر کا دور مختلف تھا اس محبت میں خواہشوں کے تقاضے اور خلوتوں کے مرحلے بھی شامل ہوگئے لیکن بہرحال........... یہ بھی محبت تھی محض ہوس نہیں تھی۔ .... میرے معاملے میں تو عشق میں بھی تاریخ نے خود کو دہرا لیا اور توصیف بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس اعتبار سے میں کافی بدنصیب ہوں میرے حصے میں صرف چند دن کی محبت آئی ہے۔''

اس نے گھڑی دیکھی اور گاڑی راؤنڈ اباؤٹ سے دوسری طرف موڑ کی سڑک پر موڑ لی۔ جمیل ذرا چونکتے ہوئے بولا آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''ذرا چنیسر ہالٹ تک جانا ہے ایک کام یاد آگیا ہے۔

اس دوران میں بات بھی مکمل ہو جائے گی۔'' نایاب نے جواب دیا۔

جمیل نے گویا اطمینان کی سانس لی تب نایاب نے پوچھا ''آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ جو دوسری دفعہ میری دنیا اجڑی ہے اس پر میرے اندر کی کیا کیفیت ہے؟''

''چھوڑیں جی....... اب مرنے والے کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا نا .... آپ جوان ہیں، حسین ہیں .... توصیف جیسے نہ جانے کتنے قدر دان آپ کو مل جائیں گے۔'' جمیل بے پرواہی سے بولا۔

''یہ گویا اس کا تسلی دینے کا انداز تھا۔ نایاب نے ایک بار ایک نظر اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر بے نیاز سا ہی دکھائی دینے لگی۔

''میرے لئے سب کچھ ختم ہو گیا ہے جمیل صاحب! میرے لئے جیسے اب دنیا میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میرے اندر کی دنیا اجڑ گئی ہے۔ میں اندر سے کھنڈر ہو گئی ہوں .... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی

نظر صرف انسان کی ظاہری سراپا تک جا سکتی ہے۔'' کہتے کہتے نایاب نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ہماری اور آپکی کی عمر اب اس قسم کی جذباتی باتیں کرنے کی نہیں ہے۔'' جمیل نے گویا اسے مزید سمجھایا۔'' جوانی اتنی تیزی سے گزر جائے گی کہ پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ہمیں جلدی جلدی زندگی سے زیادہ سے زیادہ خوشیاں حاصل کر لینی چاہیئں۔''

''واہ........! کتنی عمدگی سے آپ نے اپنا فلسفہ حیات بیان کر دیا۔ آپ واقع ایک لاجواب انسان ہیں جمیل صاحب !'' نایاب نے کہا اور ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ جمیل کی باچھیں پھیل گئیں۔

چنسیر ہالٹ کا ریلوے کراسنگ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جلد ہی وہاں جا پہنچے اس وقت گھنٹی بج رہی تھی اس ٹریفک کو روکنے کیلئے دونوں طرف سے لمبے پائپوں سی بنی ہوئی رکاوٹیں نیچے آ رہی تھیں لیکن

نایاب نے اس طرح عین آخری لمحوں میں اپنی طرف کی رکاوٹ کے نیچے سے گاڑی گزار لی۔ جس طرح عموما بہت سے بے صبرے ڈرائیور نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کی گاڑی گزرتے ہی پچھلی طرف بھی رکاوٹ نیچے آ گئی اور آگے بھی رستہ بند ہو چکا تھا اب ان کی گاڑی عین کراسنگ کے بیچوں بیچ پٹریوں پر کھڑی تھی۔ شاید پھاٹک کچھ تاخیر سے ہی بند کیا گیا تھا۔ کیونکہ ٹرین آتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ اس کی خفیف سے گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ پھاٹک والے نے گاڑی والی کی جلدی بازی پر اچھی خاصی اونچی آواز میں اسے برا بھلا کہتے ہوئے گویا اسے نکل جانے کا موقع دینے کی خاطر لیور کھینچ کر رکاوٹ اوپر کر دی تھی۔ مگر نایاب نے گاڑی آگے نہیں بڑھائی۔ جمیل بھی یہی سمجھا تھا کہ نایاب سے غلطی ہو گئی تھی لیکن اب راستہ کھل جانے کے باوجود اس نے گاڑی

آگے نہیں بڑھائی تو اس نے گھبرا کر نایاب کی طرف دیکھا۔

نایاب اسکی طرف دیکھ کر مسکرائی اور انجن بند کر دیا۔ پھر اس نے چابیاں اگنیشن سے نکال کر بڑے زور سے پٹریوں کے درمیان اسی طرف پھینک دی جدھر سے ٹرین آرہی تھی۔ وہ اسی مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے بولی" خدا کا شکر ہے کہ ٹرین بالکل صحیح ٹائم پر آرہی ہے......خیر......ویسے بھی یہاں سے تو ہر دس پندرہ منٹ بعد کوئی نہ کوئی ٹرین گزرتی ہی رہتی ہے۔"

جمیل اس کی بات سنے بغیر بوکھلا کر بولا" یہ......یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

وہی جو میں کرنا چاہ رہی تھی۔ میں خوش ہوں کہ یہ کام عین میری مرضی کے مطابق ہورہا گیا۔"

ٹرین گڑگڑاتی ہوئی کافی قریب آچکی تھی، کراسنگ پر دونوں طرف

گاڑیوں میں اور بغیر گاڑیوں والے لوگ دم بخود یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ بعض نے چیخ کر کچھ کہا۔ دو چار افراد نے جذبہ انسانیت کے تحت آگے آکر گاڑی کو دھکا بھی لگانے کی کوشش کی لیکن نایاب نے ہینڈ بریک لگا دی تھی۔

ٹرین کو بالکل قریب آتے دیکھ کر وہ لوگ خوفزدہ ہو کر دور بھاگ گئے تھے اور تب جمیل نے بھی گویا دہشت زدگی کے اثر سے باہر آتے ہوئے دروازہ کھولنا چاہا ان آخری لمحوں میں بھی وہ شاید باہر چھلانگ لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی جان بچ سکتی تھی مگر دروازے مقفل تھے اس نے دروازہ کھولنے والا لیور بھی کھینچا لیکن دروازہ نہ کھلا تب اسے ٹرین کی گڑگڑاہٹ کے درمیان نایاب کا دیوانگی آمیز سا قہقہہ اور پھر اس کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

''وہ کہہ رہی تھی'' دروازوں کے لاک سسٹم میں خرابی ہے..... صرف

مجھے ہی معلوم ہے کہ دروازے کیسے کھلتے ہیں۔''

''تو.......کھولونا..........'' وہ دہشت سے چیخا۔

نایاب نے قہقہہ لگایا.......

ٹرین چلانے والے نے شاید آخری لمحوں میں بریک لگانے کی بھی کوشش کی تھی کیونکہ لوہے کی رگڑ کی تیز آواز ابھری تھی مگر وہ ٹرین کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ موقع پر موجود کئی لوگوں نے خوف سے آنکھیں بند کرلی تھیں اور ٹرین اسی چھوٹی سے ہلکی پھلکی گاڑی کے پرخچے اڑاتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔

زوردار دھماکہ گڑگڑاہٹ اور بریکوں کے شور میں کسی کو جمیل کی آخری دہشت زدہ چیخ بھی سنائی نہ دے سکی۔ نایاب نے چیخ نہیں ماری وہ زندگی کے آخری لمحے تک پرسکون رہی تھی!۔....

ختم شدہ

چاہت

اس کی چاہت کے رنگ نرالے تھے وہ
چاہتوں کے سمندر میں لہروں کی مانند
ادھر سے ادھر تک کا سفر کرتی رہی' مگر
سمندر اسے ہر مرتبہ اپنے میں سمو لیتا۔